بادۂ خیّام

پروفیسر غلام دستگیر شہاب

بادۂ خیّام

رُباعیاتِ خیام کا منظوم ترجمہ

پروفیسر غلام دستگیر شہاب

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی کے جزوی مالی تعاون سے

اشاعت : دسمبر سنہ ۱۹۸۳

تعداد : ایک ہزار

کتابت : اکبر مرزا مالیگاؤں

طباعت : مہاراشٹر پرنٹنگ اسکول پونہ ۔

قیمت : ۲۵ پچیس روپے

ناشر : ظفر اقبال

۴۳۸ سینٹر اسٹریٹ ۔ پونہ ۱

تقسیم کار :

- مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، پرنسیس بلڈنگ ۔ محمد علی روڈ ۔ بمبئی ۳
- مکتبہ آموزگار، کاشانہ سہیل ۔ ۲۷ بھوانی پیٹھ ۔ جلگاؤں
- محب بکڈپو، محمد علی روڈ، بمبئی ۳
- نفیس بکڈپو، کیمپ مارکیٹ ۔ پونہ ۱

انتساب

مادرِ علمی

- مدرسہ عثمانیہ، ایولہ ضلع ناسک
- اینگلو اردو ہائی اسکول، پونہ
- واڈیا کالج، پونہ

کے نام!

جن کے حیات پرور ماحول نے
میرے فکر و فن کو جلا بخشی۔

پروفیسر غلام دستگیر شہاب
سابق صدر شعبۂ اُردو، فارسی۔ پونہ یونیورسٹی

بادۂ خیام اور سہیل

خیام مجھے نوعمری سے پسند ہے ۔ جب پڑھتا تھا تب سے رباعی پسند تھی۔
ملازم ہوا تو تیسرے سال کاس الکرام، رباعیات عمر خیام، شرح ادیب ایبٹ آبادی
منگوائی ۔ بہترین کتاب تھی ضائع ہوگئی ۔ وہ ابواب قائم کر کے ہر باب کی ابتدا
شعراء گرامی کے اشعار سے کرتے پھر رباعی پر آتے ۔ رباعی، مشکل الفاظ اور
شرح لکھتے ۔ کتاب کا دیباچہ بہت طویل تھا ۔ انگریزی کے اسکالر تھے ۔ تمام یورپی
اہل قلم کی غلطیاں بتائیں مگر ادب کے ساتھ ۔

اس کتاب میں پانچ سو سے زیادہ رباعیاں تھیں ۔ سید سلیمان کی خیام
(رسرچ) دیکھی، اس میں صرف ڈھائی سو تھیں ۔

ایک نسخہ ۱۹۳۲ء میں پونہ میں مل گیا تھا ۔ جیبی سائز ٹائپ کا، کاغذ
عمدہ، طہران کا چھپا ہوا ۔ کسی گورنر نے چند سطریں دیباچہ کے ساتھ چھپایا تھا ۔
وہ میری جیب میں دس برس رہا ۔ ایک مہربان لے گئے ۔ پھر سے نوبت نہیں
آئی نہ اچھا نسخہ ملا ۔

میں نے ۱۹۷۳ء میں مسلّم صاحب سے کہہ کر سلام سندیلوی ڈاکٹر کی
'اردو رباعیات' منگوائی ۔ ضخیم کتاب ہے ۔ میری رعایت سے لائبریری میں آئی ۔
اسے دیکھا، اچھی کتاب ہے ۔ 'روپ' فراق کی ۱۹۴۶ء میں دیکھ چکا تھا ۔

اس کا ننگاپن میری طبیعت کے منافی ہے۔ پسند نہیں، اگرچہ مصوّر اچھے تھے۔
جاں نثار اختر کی 'گھر آنگن' بھی دیکھی، سادہ ہے۔ عورت پر کتاب مشتمل ہے۔

بہر حال قدما کی بیشتر رباعیاں خواہ اُردو کی ہوں خواہ فارسی کی خوب دیکھیں۔ آسی شارح دیوانِ غالب کی رباعیاں اور شفق عماد پوری کی کتابی رباعیاں منگوائیں، انھیں دیکھا۔ آسی خالی خولی ہیں۔

شاد عظیم آبادی کی رباعیات بڑے اہتمام سے چھپی ہیں معزز آدمی تھے۔ ان کی رشتہ دار کوئی اونچی ڈگری کی عورت ہے اس نے دیباچہ لکھا۔ مناظر احسن گیلانی کا دیباچہ غضب کا ہے۔ رباعیاں زبان کے اعتبار سے خوب ہیں۔ خیام کا مزہ نہیں۔

یگانہ چنگیزی غضب کی رباعی کہتے تھے، کاش وہ لڑاکے اور مذہب بیزار نہ ہوتے۔ ۱۹۳۳ء میں 'ترانہ' منگوایا۔ پچاس ساٹھ رباعیوں کا جواب اُردو میں نہیں۔ جوش اور فراق ماند پڑتے ہیں۔ اگرچہ جوش نے حد کر دی ہے۔ ہزاروں رباعیات لکھنے والا خرافات پر اُتر آیا، فلسفے میں خام تھا۔

میں نے دبیر اور انیس کی رباعیاں بھی دیکھیں۔ شوکت اور صفائی میں انیس اور معنی آفرینی اور رعایتِ لفظی کے بعض انوکھے محاسن دبیر کے ہاں زیادہ ہیں۔ محوی لکھنوی، محروم، ضیا فتح آبادی، لبھو رام جوش بھی اچھے ہیں۔ محروم کافی سنجیدہ نگار ہیں۔ محمود اسرائیلی مرحوم نے رباعیاں لکھی ہیں، بہت صاف اور مؤثر۔ بچوں کے لیے الگ رباعیاں ہیں۔ بہت محنتی بزرگ

تھے اور جوانی میں اسلامی ممالک کی سیر کر چکے تھے۔ مولانا محمدّ علی کے سکریٹری بھی رہے۔ مجھے کہتے تھے: "میاں تمھاری فارسی اچھی ہے مگر بند کرو، کون داد دے گا۔ ایران نے غالب کو منھ نہیں لگایا" وہ خود انگریزی نظموں کا مجموعہ لکھ چکے تھے۔ کسی قابل انگریز کو سنایا تو اس نے کہا خوب ہے۔ مگر انگریز کب مانے گا۔ آج کل کوئی فاروقی ہیں وہ بھی لکھ رہے ہیں۔

نریش کمار شاد کو میں نے ارکانِ رباعی سمجھائے تھے۔ ۱۲ رباعیاں انھوں نے لکھی تھیں۔ نہایت خوبصورت رومانی تھیں۔ ان کو میں نے کہا تھا کہ اگر دو سو لکھو تو تم زندۂ جاوید ہو جاؤ گے۔ معلوم یہ ہوا رباعی میں مجاز مطلق رومانی کی گنجائش نہیں ہے۔ خود جوش نے ساٹھ ستّر رباعیاں نہایت اچھی لکھی ہیں مگر اس سے زیادہ نہ لکھ سکے۔

پچاس برس پہلے آغا شاعر قزلباش کا ترجمہ جو خیام کی رباعیوں کا تھا، دیکھا۔ دل کو نہ لگا۔ قدیم ترین لوگوں کے نام یاد نہیں، ان کے ترجمے بھی برائے نام تھے۔

امجد حیدر آبادی، قدرت کا نہایت شریف بندہ، الفاظ سلیس و رواں، آیاتِ قرآنی کا مفسّر، اخلاق کا ترجمان، شریف لوگوں نے اس کا جشن منایا۔ ماجد دریابادی شریک ہوئے۔ دو مجموعے خوبصورت چھپے۔ اللہ کی رحمت ہو اُن پر۔

میں نے جو کچھ کہا ہے قابلِ اعتنا نہیں ہے۔ بدنام ہوا تو کیا کرتا، اسی سے دل بہل گیا۔ اب چھ سات سو رباعیاں حالات و واقعات اور

وطن کی بدنظمی پر ہوئی ہیں۔ بس اظہارِ خیال ہے، جیسے سیماب کا 'عالمِ آشوب'
فارسی اپنی ساخت کے اعتبار سے اور ترنم کے لحاظ سے دنیا کی منفرد زبان
ہے۔ ترنم الفاظ سے معانی کے محاسن بڑھ جاتے ہیں۔ جیسے ٹیگور کی بنگالی نظموں
کی صورت ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سنسکرت کو بھی ان خوبیوں سے مالامال پایا۔
فارسی اسی سے نکلی ہے لیکن ایرانی فطرت کی نفاست سے نفیس تر ہوگئی ہے۔

خیام سے بہتر کہنے والا کوئی نہیں۔ آپ کے ترجمے خوب ہیں۔ سہل ممتنع'
ترجمے میں آسانی' جہاں آزاد ترجمہ ہے وہ بھی خوب ہے۔ آپ کے ترجمے سے
جی خوش ہوگیا۔ دقیق مضامین جو صوفیانہ رباعی گو تھے انھوں نے پیدا کیے۔ جن میں
سلاست کم' تلازمِ لفظی اور تقابلِ تجنیس بھی کم سے کم تر ہے جو نظم کے لیے خوش وضع
لباس ہے۔ آپ نے بڑی محنت کی ہے تب کہیں خیام کی سہل ترین رباعیاں اُردو
قالب میں اس طرزِ نگارش میں آئیں۔ بہرحال آپ کی اُردو رباعیاں یقینی طور پر
اہلِ نظر اور باذوق اصحاب پسند کریں گے۔

سہیل مالیگانوی

۱۳ اپریل ۱۹۸۳ء

پیش لفظ

۱۸۵۷ء میں فٹز جرلڈ نے رباعیاتِ خیام کا انگریزی رباعیوں میں ترجمہ کیا۔ اس کے نتیجے میں خیام کو عصر حاضر میں جو عالمگیر شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ کسی اور مشرقی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ بلاشبہ خیام جاوداں بن چکا ہے۔ دنیا کی تقریباً تمام مہذب زبانوں میں خیام کی رباعیات کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اُردو میں بھی اس کے ترجمے ہوئے ہیں۔ ان میں آغا شاعر قزلباش کا "خمکدۂ خیام" پروفیسر واقف مرادآبادی کا "ترجمۂ خیام" اور عبدالحمید عدم کی کتاب "دو جام" قابلِ ذکر ہیں۔

ہندوستان کی اکثر یونیورسٹیوں میں حافظ اور سعدی کے ساتھ ساتھ خیام بھی نصاب میں شامل ہے۔ درس و تدریس کے زمانے میں مَیں نے محسوس کیا کہ فارسی رباعی کی شرح کرتے وقت اگر اس کا اُردو رباعی میں ترجمہ پیش کیا جائے تو طلبہ کی دلچسپی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی حقیقت میرے لیے ترجمہ کی محرک بنی اور میں نے ابتداءً تیس چالیس رباعیوں کا ترجمہ کر ڈالا۔

جب زیدؔ عابد (مرحوم) پونہ آئے تو میں نے انھیں یہ رباعیاں سنائیں۔ وہ بہت خوش ہوئے اور مصر ہوئے کہ میں یہ سلسلہ جاری رکھوں۔ ۱۹۸۱ء میں مَیں کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوا اور اس کے بعد عمر خیام کا ترجمہ میرا

اہم مشغلہ بن گیا۔ میں رباعیوں کے ترجمے کرتا اور انھیں اپنے ہم مشربوں ڈاکٹر ایات، پروفیسر سرکشن ناڈکرنی، بشیر احمد انصاری، حنیف ساغر اور امان اختر کو سناتا۔ اس سے میرے حوصلوں کو تازگی ملتی۔

"بادۂ خیام" میں خیام کی تقریباً دو سو رباعیوں کا اردو میں ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ رباعیوں سے قبل خیام کے سوانح حیات، اس کی تصنیفات اور رباعیات پر تبصرہ ہے۔ اس کی ترتیب میں مولانا سید سلیمان ندوی کی فقید المثال تصنیف "خیام" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

خیام کے سلسلے میں میں نے بہت ساری انگریزی، فارسی اور اردو کتابیں دیکھ ڈالی ہیں لیکن مولانا سید سلیمان ندوی کی "خیام" سے بہتر اور مدلل معلومات اور کہیں نہیں ہیں۔ خیام کے عربی اور فارسی رسائل کی روشنی میں خیام کے افکار و نظریات کا جو جائزہ مولانا نے پیش کیا ہے اور اس کے آئینے میں خیام کی شخصیت کے جو خدوخال نمایاں ہوتے ہیں وہ کسی اور تصنیف میں نظر نہیں آتے۔

دوسرا مسئلہ خیام کے صحیح نسخہ اور آوارہ گرد اور مخلوط و مشترک رباعیوں کا ہے۔ اس کے ابتدائی نسخوں میں رباعیوں کی تعداد دو ڈھائی سو سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن امتدادِ زمانہ سے اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ نولکشور ایڈیشن میں ان کی تعداد ۷۷۰ ہے۔ لہٰذا ان غیر خیامی رباعیوں کے انبار میں خیام کی اصل رباعیاں کھو سی گئی ہیں اور خیام کی سیرت اور شاعرانہ شخصیت کے خدوخال مسخ ہو کر رہ گئے ہیں۔ لہٰذا اس مسئلہ پر بھی مولانا نے جس انداز سے بحث کی

ہے اور مخلوط و مشترک رباعیوں کی گتھّی سلجھانے کی کوشش کی ہے وہ نہایت ہی اہم ہے۔ اِس سے خیّام کی اصل رباعیوں کی جانچ پڑتال میں مدد مل سکتی ہے۔ اور ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خیّام کی اصل رباعیاں کونسی ہوسکتی ہیں اور غیر خیّامی رباعیاں کونسی۔

اس کے علاوہ خیّام کے سوانح اور زندگی کے حالات جس قدر شرح و بسط سے یہاں دیے گئے ہیں وہ دوسری کتابوں میں موجود نہیں ہیں۔

مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن دارالمصنّفین اعظم گڈھ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے استفادہ کی اجازت عنایت فرمائی۔

حضرت سہیل مالیگانوی (''سفینہ'' اور ''درد و داغ'' کی رباعیات کے مُصنّف) اور ڈاکٹر امانت صاحب نے رباعیات کے سلسلے میں جو مفید مشورے دیے ہیں اس کے لیے میں اُن کا مشکور ہوں۔

مجّبی بشیر احمد انصاری، امان اختر اور حکیم رازی صاحبان کا سپاس گزار ہوں کہ ''بادۂ خیّام'' کے آغاز سے لے کر اس کی اشاعت کے تمام مرحلوں میں ان کا تعاون حاصل رہا ہے۔

دستگیر شہاب

دسمبر ۱۹۸۳ء

عمر خیّام

سوانح، تصانیف اور تبصرہ

۴۴۰ھ - ۵۲۶ھ ______________ ۱۰۴۸ء - ۱۱۳۲ء

حکیم عمر خیّام ۴۴۰ھ (۱۰۴۸ء) میں نیشاپور میں پیدا ہوا اور ۵۲۶ھ (۱۱۳۲ء) میں اپنے وطن ہی میں راہیٔ عدم ہوا اور حیرہ نامی قبرستان میں مدفون ہوا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر تقریباً ۸۶ سال کی تھی۔

خیّام کا نام عمر، والد کا نام ابراہیم اور تخلّص خیّام تھا۔ بعض عربی اور فارسی کتابوں میں اس کا نام الخیامی اور الخیمی بھی مذکور ہے۔ لیکن اس نے بحیثیت شاعر ہمیشہ خیّام تخلص استعمال کیا ہے۔ عربی میں خیّام کے معنی خیمہ دوز یا خیمہ ساز کے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے آبا و اجداد کا پیشہ خیمہ دوزی تھا۔

خیّام کے زمانے میں نیشاپور علوم و فنون کا مرکز تھا۔ بکثرت مدرسے اور بڑی بڑی درسگاہیں تھیں۔ جتنے فرقے اور جماعتیں تھیں اتنی ہی درسگاہیں تھیں۔ ایسے ماحول کی آغوش میں خیّام پلا بڑھا اور پروان چڑھا۔ اور سترہ سال کی عمر میں اپنے ہمعصروں سے بڑھ کر کمال حاصل کیا۔

خیّام نے ہندسہ اور علم ہیئت کی تعلیم ابوالحسن انباری جیسے مشہور استاد

سے حاصل کی۔ مجسطی جو یونانی ہیئت کی سب سے بڑی اور مشہور کتاب ہے اسی استاد سے پڑھی۔ فلسفہ غالباً ابو سینا یا اس کے شاگرد ابو منصور حسین اصفہانی سے سیکھا۔ وہ ابو علی سینا کو اپنا استاد (معلم) کہتا تھا۔ انتقال کے وقت بھی ابو علی سینا کی مشہور کتاب شفا کی الٰہیات خیام کے زیرِ مطالعہ تھی۔

خیام اپنے زمانے کا ابو علی سینا تھا۔ بیہقی اور شہرزوری کے مطابق علوم و حکمت کی مختلف قسموں میں ابو علی سینا کے بعد وہی تھا۔ لیکن فلسفہ و ریاضیات اور معقولات میں وہ یگانہ تھا۔ قِفطی بھی اسے پیشوائے خراسان اور علامۂ زمان کے القاب سے یاد کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ علمِ نجوم اور فلسفہ میں خیام کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ شہرزوری میں ہے کہ اگر حکمائے خراسان کا شمار کیا جائے تو خیام ان میں بحرِ ذخار اور سب سے بلند مرتبہ اور رباعیات میں سب سے بڑا اور ریاضیات میں سب سے بڑھ کر ہوگا۔

سیّد سلیمان ندوی خیام کی مختلف صفات اور متنوع کمالات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

خیّام کی یہ کیسی بدبختی ہے کہ وہ مشرق میں تمام علوم حکمت میں نجوم کا ماہر مانا گیا اور مغرب میں وہ صرف ایک بادہ پرست شاعر ہو کر رہ گیا۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں اس کے اصل مرتبہ سے بہت ہی کم درجہ تھیں۔ انتہا یہ ہے کہ عروضی سمرقندی نے بھی جو خیام کو اپنا استاد کہتا ہے اپنی مشہور تصنیف چہار مقالہ میں اس کے منجمانہ کمالات ہی کی دو تین مثالیں دی ہیں۔

علمِ طب میں اسے بڑا کمال حاصل تھا۔ وہ ملک شاہ سلجوقی کا شاہی طبیب

تھا۔ جب شہزادہ سنجر کو بچپن میں چیچک نکل آئی تھی تو خیام ہی نے اس کا علاج کیا تھا۔

عقلیات کے علاوہ علومِ نقل پر بھی اسے عبور حاصل تھا۔ وہ لغت، فقہ اور تاریخ کا عالم تھا۔ حتیٰ کہ قرأت جیسے علم میں بھی وہ دسترس رکھتا تھا۔ تفسیر اس کے دائرے کی چیز نہ تھی۔ مگر شہرزوری نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ "مرو" میں قاضی عبدالرشید نے خیام سے معوذتین کا مطلب پوچھا اور سورۂ ناس میں بعض الفاظ کی تکرار کی وجہ دریافت کی۔ خیام نے وہیں اپنی معلومات کا دریا بہانا شروع کر دیا۔ اور اس تفصیل سے اس کی تفسیر بیان کی کہ اگر اس کی تقریر قلمبند کر لی جاتی تو ایک کتاب ہو جاتی۔ شہرزوری کہتا ہے:

"حالانکہ یہ وہ فن ہے جس کے حصول کے لیے خیام نے خصوصی توجہ نہیں کی تھی۔ اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جس فن کے حصول میں اس نے اپنی تمام تر زندگی صرف کی اس میں اس نے کیا کچھ کمال پیدا نہیں کیا ہو گا۔"

اس میں شک نہیں کہ خیام ریاضیات کا ماہر تھا اور اس فن میں بے نظیر تھا۔ ہندی ریاضیات سے بھی اسے واقفیت تھی۔ وہ کہتا ہے کہ اہلِ ہند کو ایسے چند طریقے معلوم ہیں جن سے مربع اور مکعب کا ضلع آسانی سے نکال لیتے ہیں۔ پھر کہتا ہے کہ میں نے ایسے طریقوں پر ایک کتاب لکھی ہے۔ ابن خلدون اسے مشرق کا سب سے عظیم ہندسہ داں قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس رسالے میں سہ درجی الجبرائی مساوات (المعادلۃ الجبریہ Algebraic Equations) کے اصول باقاعدہ طریقے سے پہلی مرتبہ مرتب کیے گئے ہیں۔ عرب ریاضی دانوں میں اس کی تحقیقات کا بڑا چرچا تھا۔

علم ریاضیات کی ترقی میں خیام نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ یورپ میں اس علم کی ابتدائی شکل ۱۷۴۲ء میں یعنی تقریباً چھ صدی بعد نظر آتی ہے۔ خیام کی ریاضیات کا مخطوطہ لیڈن میوزیم میں موجود ہے۔ جب خیام کی کتاب کا مطالعہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ ڈیکارٹ (۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۰) نے خیام کے نتیجۂ فکر کا ہی اعادہ کیا ہے۔ اور یہ کہ خیام اس سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ بد قسمتی سے اس علم سے متعلق خیام کی بہت ساری کتابیں ضائع ہو گئی ہیں۔ اگر وہ بھی حاصل ہو جاتیں تو پتہ چلتا کہ خیام کی تحقیقات کس مقام پر پہنچ چکی تھیں۔

اس کے علاوہ اقلیدس کی کتابوں کی مشکلات اور ان کے حل پر بھی خیام نے تین کتابیں تصنیف کی تھیں جن میں ان مشکلات کو حل کیا گیا تھا جنھیں اس سے قبل کے صاحبانِ فن حل کرنے سے قاصر تھے۔

آخری چیز اس کی ادب و شاعری ہے۔ اس کے تمام رسائل عربی میں ہیں۔ اس کی نثر میں ایک حد تک زور ہے۔ اس کے رسالۂ جبر و مقابلہ کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسے عربی پر بڑی قدرت حاصل تھی۔

خیام عربی و فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتا تھا۔ اس کی فارسی کا کیا کہنا، مگر اس کی عربی شاعری میں وہ زور نہیں جو اس کی فارسی رباعیات میں موجود ہے۔

اس کا حافظہ ایسا قوی تھا کہ اس نے اصفہان میں ایک دفعہ ایک کتاب' جو غالباً نایاب تھی' سات دفعہ بغور پڑھی تھی اور یاد کر لی۔ اور نیشاپور آکر لکھوا دی۔ اور جب اصل سے مقابلہ کیا گیا تو کچھ زیادہ فرق نہ نکلا۔

خیاؔم نے متاہلانہ زندگی بسر کی تھی ۔ اور اس کی اولاد میں کم از کم ایک لڑکی تھی جس کی شادی اس کی زندگی ہی میں بغداد کے کسی فاضل سے ہوئی تھی جس کا نام امام محمد بغدادی تھا ۔ اس کے علاوہ دولت شاہ سمرقندی نے (۸۹۲ھ) تذکرۃ الشعراء میں ایک شاعر اشہری نیشاپوری کا ذکر کیا ہے جو خیام کے سلسلۂ اولاد میں سے تھا اور مشہور قصیدہ نگار ظہیر فاریابی کا شاگرد تھا اور شاہی دفتر کا منصب دار تھا ۔

خیاؔم کا طالب علمی کا زمانہ ۴۶۰ ہجری (۱۰۶۸ء) میں ختم ہوتا ہے ۔ اس کے بعد اس نے درس و تدریس کے بجائے غالباً تحریر و تصنیف کا کام اپنے لیے پسند کیا ۔ اس کا دماغ زیادہ تر ریاضیات کے لیے موزوں تھا ۔ اور ریاضیات میں مساحت، جبر و مقابلہ، اور اقلیدس کی طرف اس کا میلان تھا ۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک مبحث پر ایک رسالہ لکھا ۔ جس میں اس فن کی مشکلات کو حل کیا اور مسائل کی نئی نئی صورتیں نکالیں اور ان کو ثابت کیا ۔

اس وقت سلجوقی حکومت کا عہد زریں تھا لیکن وہاں تو صرف دینی علوم کی قدردانی تھی ۔ مجبوراً خیاؔم کو غزنی، بخارا، اور دوسری حکومتوں کی جانب رُخ کرنا پڑا ۔ لہٰذا وہ ترکستان آیا ۔ قاضی ابو طاہر سمرقندی نے اس کی سرپرستی کی جو ترکستان کی ایلخانی سلطنت میں قاضی القضات کے عہدہ پر فائز تھا ۔ خیاؔم نے اپنی تصنیف "الجبر و مقابلہ" اس کے نام معنون کی ہے ۔ اس سے قبل خیاؔم نے جو رسالہ تصنیف کیا تھا اس کا نام "البرہان علیٰ استخراج اضلاع المربعات والمکعبات" تھا ۔ اس کی نسبت اس نے دعویٰ کیا ہے کہ اس میں ایسے اصول دریافت کیے گئے

ہیں جو ہنوز دریافت نہیں ہوئے تھے۔

اس باکمال مربّی نے خیام کو وہاں کے شاہی دربار تک پہنچایا اور شمس الملک خاقانِ ترکستان سے متعارف کروایا۔ اس کے بعد خیام کی ترقی کی راہیں کھل گئیں۔ خاقان نے خیام کے علم و فضل کی بڑی قدردانی کی۔ بیہقی اور شہرزوری میں ہے کہ خاقان شمس الملک خیام کی بڑی عزّت کرتا تھا اور اس نے اسے اپنے ساتھ تخت پر بھی بٹھایا تھا۔

خیام کو چھ سال تک شمس الملک کی سرپرستی حاصل رہی۔ ۴۶۶ھ میں اس ایلخانی بادشاہ کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد خیام ترکستان سے فارس آیا۔ اس نے سلجوقی دربار میں رسائی حاصل کرلی۔ اس وقت سلجوقی خاندان کا سلطانِ اعظم ملک شاہ سلجوقی فرماں روا تھا۔ اس نے ۴۶۵ھ سے ۴۸۵ھ تک حکومت کی۔ رے اس کا دارالخلافہ تھا اور اس کی سلطنت کا دائرہ کاشغر سے لے کر قسطنطنیہ کی حدود تک پہنچتا تھا۔ اس کا وزیر نظام الملک طوسی تھا جو اپنے فضل و کمال، تدبّر اور سیاست دانی کے لیے مشہور تھا۔ ملک شاہ اور نظام الملک نے جہاں بڑے بڑے کام کیے انھیں میں سے ایک رصد خانے کی تعمیر بھی ہے۔ اس کے لیے عمر خیام کو دیگر علمائے ہئیت کے ساتھ اصفہان بلوایا گیا۔ اور رصد خانے کا کام ۴۶۷ھ (۱۰۷۴ء) میں شروع ہوا۔

اصفہان پہنچ کر اس کی شہرت نے پر پرواز حاصل کیے۔ رصد خانے کی تعمیر کے بعد وہ مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے فلکیات کی تحقیقات کا کام کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ دربارِ شاہی میں طبیب اور منجم کی حیثیت سے رسائی حاصل کی۔

اور اس کے بعد بہت جلد شاہی ندیموں کے زمرے میں شامل کر لیا گیا۔ خیام ۴۶۷ھ (۱۰۷۴ء) سے لے کر ۴۸۵ھ (۱۰۹۲ء) تک یعنی ۱۸ برس تک شاہی دربار سے منسلک رہا۔ اس عہد میں اس کا سب سے بڑا کام رصد خانہ ملک شاہی کی تعمیر و قیام اور اس میں فلکیاتی تحقیقات کا کام تھا۔ اس نے تحقیقات کے بعد زیجِ ملک شاہی تیار کی اور تاریخ جلالی ملک شاہی کا آغاز ہوا۔ اس کے علاوہ اس دوران میں اس نے رسالہ کون و تکلیف اور بعض دیگر کتابوں کی تصنیف کی۔

سلطان ملک شاہ سلجوقی نہایت ہی شان و شوکت والا بادشاہ تھا۔ اس کا وزیر نظام الملک بھی اتنا ہی عظیم وزیر تھا۔ ۴۸۵ھ (۱۰۹۲ء) میں نظام الملک ایک متعصّب فدائی کے خنجر سے شہید ہوا جو ایک تشدّد پسند فرقے باطنیہ سے تعلق رکھتا تھا اور جس کا سرغنہ حسن بن صبّاح تھا۔ ملک شاہ بھی اپنے عزیز وزیر کی وفات کے چند مہینوں بعد انتقال کر گیا۔ دونوں کے انتقال سے سلجوقی حکومت کی بنیاد متزلزل ہو کر رہ گئی۔

ملک شاہ کے بعد اس کا بیٹا برکیارق تخت پر بیٹھا۔ اس نے ۱۳ برس حکومت کی۔ اس کے عہد میں عمر خیام کا دربار سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ غالباً اس دوران میں عمر خیام اصفہان کے رصد خانے میں تحقیقات میں مصروف رہا۔

برکیارق کے بعد سلطان محمد بن ملک شاہ ۴۹۸ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں عروضی سمرقندی نے خیام سے متعلق منجّمی کے دو واقعات

"چہار مقالہ" میں نقل کیے ہیں۔

ایک واقعہ بادشاہ کے شکار کی تاریخ کے سلسلے میں ہے۔ عروضی نے بیان کیا کہ ایک روز بادشاہ نے خیام کو کہلا بھیجا کہ شکار کے لیے کوئی ایسی موزوں گھڑی مقرر کریں کہ دو تین دن بارش نہ ہو۔ خیام نے ساعت اور دن مقرر کیا۔ جب بادشاہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سوار ہوا تو اچانک زور کی آواز آئی اور ابر چھا گیا۔ لوگ یہ دیکھ کر ہنسنے لگے۔ خیام نے بادشاہ سے کہا کہ مطلع ابھی صاف ہوا جاتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور چار پانچ دن تک مطلق بارش نہیں ہوئی۔

سلطان محمد کے بعد اس کا بیٹا اور اس کے ایک سال بعد ملک شاہ کا فرزند سلطان سنجر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ ۵۱۱ھ سے ۵۵۲ھ (۱۱۱۴ء سے ۱۱۵۶ء) تک تقریباً ۱۲ سال حکومت کی۔ لیکن اس عہد میں ہم کو خیام کا دربارِ شاہی میں پتہ نہیں ملتا۔ سلطان سنجر بچپن میں چیچک کے مرض کا شکار ہو گیا تھا اور عمر خیام نے اس کا علاج کیا تھا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ چہرہ داغدار ہو گیا تھا۔ اس لیے سنجر خیام سے خوش نہ تھا۔ یہی سبب ہے جو ۵۱۵ھ کے بعد سے خیام شاہی دربار میں نظر نہیں آتا۔ غالباً اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔

الغرض نہ صرف یہ کہ خیام کو شاہانِ وقت کی سرپرستی حاصل تھی بلکہ مختلف امرار اور وزرار سے بھی خیام کے گہرے روابط تھے اور وہ بھی خیام کو بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے اور زر و سیم سے اس کی

حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

اس عہد میں یعنی پانچویں صدی ہجری کے نصفِ آخر اور چھٹی صدی کے اوائل میں بڑے بڑے صاحبانِ فضل و کمال زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہیئت داں تھے جنھوں نے اصفہان میں شاہی رصد خانے کی تعمیر اور فلکیات کی تحقیقات میں عمر خیام کا ساتھ دیا، آزاد خیال دانشور تھے جو یونانی فلسفہ بالخصوص ابو علی سینا کے پرستار تھے۔ متکلمین تھے جو عمر خیام جیسے حکیموں سے مختلف مسائل پر بحث و مباحثے اور مناظرے کرتے۔ ریاضی داں، مہندس اور سائنس داں تھے جو تجربات اور تحقیقات میں مصروف تھے۔ محمد نسوی جیسے فیلسوف تھے جو عمر خیام سے مشکل مسائل پر سوالات کرتے اور عمر خیام کو ان کے جواب رسالوں کے ذریعے تحریری شکل میں دینے پڑتے، جو آج بھی موجود ہیں۔ رسالہ کون و تکلیف اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مشہور زمانہ امام غزالی بھی خیام کے معاصرین میں تھے۔ ملک شاہ کے دربار سے دونوں کا تعلق تھا۔ مگر دونوں الگ الگ مسلک کے تھے۔ خیام ابو علی سینا کا حامی اور فلسفۂ یونان کا طرفدار تھا۔ اور امام غزالی ابو علی سینا کے مخالف اور فلسفۂ یونان کے دشمن تھے اور انھوں نے اس کی مخالفت میں تہافتہ الفلاسفہ تصنیف کی تھی۔ امام غزالی اور خیام کے مباحثے مشہور ہیں۔ امام غزالی مدرسہ نظامیہ بغداد کے مدیرِ اعلیٰ تھے۔ وہ تصوف کے حامی تھے۔ دینیات، ردِ فلسفہ، علمِ کلام اور اسلامی علوم پر ان کی تصنیفات مشہور ہیں۔

ان کے علاوہ ابوالبرکات بغدادی، ناصر خسرو، سنائی اور نظامی عروضی سمرقندی جیسے بہت سارے اہلِ کمال عمر خیامؔ کے معاصرین میں سے تھے۔

خیامؔ کی وفات کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ بیہقی کا بیان ہے کہ خیامؔ ایک دن بوعلی سینا کی مشہور فلسفیانہ تصنیف شفا کی الٰہیات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جب وحدت وکثرت کی بحث پر پہنچا تو خلال کتاب میں رکھ کر کتاب بند کر دی اور کہا کہ چند سمجھداروں کو بلاؤ۔ مجھے وصیّت کرنی ہے۔ پھر وصیّت کی اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اس وقت سے پھر نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ رات کو عشاء کی نماز کے سجدے میں اس کے منھ سے یہ فقرے ادا ہو رہے تھے:

"بارِ الٰہا! تو جانتا ہے کہ میں نے اپنے امکان بھر تجھ کو جانا۔
تو مجھے معاف کر کہ میں نے تجھ کو جتنا جانا وہی تیرے حضور
میں میرا وسیلہ ہے۔"

یہ کہتے کہتے وہ مرغ خوشنوا ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ خیامؔ نے نیشاپور میں وفات پائی اور وہیں کے ایک گورستان میں جس کا نام حیرہ تھا دفن ہوا۔

خیامؔ نے اپنی قبر کی نسبت اپنی زندگی میں ایک عجیب پیشن گوئی کی تھی جو حرف حرف پوری ہوئی۔ نظامی عروضی سمرقندی اپنی مشہور کتاب چہار مقالہ میں بیان کرتا ہے کہ:

۵۰۶ ہجری (۱۱۱۲ء) میں خیامؔ اپنے ایک دوست کے ساتھ بلخ آئے

ہوئے تھے اور امیر ابوسعید کے دولت کدے پر قیام فرما تھے۔ میں ان کی مجلس میں حاضر ہوا۔ دورانِ گفتگو میں عمر خیامؔ نے کہا:

"میرا مزار ایسی جگہ ہوگا جہاں درخت سال میں دو مرتبہ گل افشانی کریں گے۔"

عمر خیامؔ کی بات پر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ خیامؔ جیسا حجت الحق جھوٹ نہیں بول سکتا۔ لہٰذا میں خاموش رہا۔

جب ۵۳۰ھ میں نیشاپور پہنچا تو چار سال ہوئے تھے کہ وہ عظیم انسان دنیا سے پردہ کر چکا تھا۔ مجھ پر اس کی استادی کا حق تھا۔ لہٰذا جمعہ کے دن میں نے اس کے مزار کی زیارت کرنا چاہی۔ ایک شخص کو اپنے ساتھ لے لیا تاکہ مزار کا پتہ بتائے۔ وہ مجھے حیرہ کے قبرستان میں لایا۔ وہاں باغ کی دیوار کے قریب اس کا مزار تھا۔ درختوں کی گھنی شاخیں اس پر سایہ فگن اور گل افشاں تھیں۔ مزار پر اس قدر پھول تھے کہ مزار پھولوں کے انبار میں نظر نہیں آ رہا تھا۔

مجھے بلخ کا واقعہ یاد آ گیا اور اس پیش گوئی کی حقیقت واضح ہو گئی جو استاد عمر خیامؔ نے اس وقت کی تھی۔ بے اختیار میری آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

تصنیفات:

خیامؔ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ تصنیف میں بخیل ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ مختلف النوع علوم وفنون میں خیامؔ کے انہماک اور

مشغولیت کا یہ عالم تھا کہ تحریر و تصنیف کے لیے وقت نکالنا اس کے لیے ناممکن سا نظر آتا ہے۔ بایں ہمہ اس نے بڑی ہی کاوش اور جد و جہد سے جبر و مقابلہ کے اصول پر بے مثال کتاب تصنیف کی۔ زیچ ملک شاہی تیار کی اور مختلف مضامینِ علم و فن پر رسائل لکھے۔ اس کے علاوہ رباعیاتِ خیام کے پڑھنے والے پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حکیم عمر خیام اواخر عمر میں اس درجہ پر پہنچ گیا تھا جہاں پر حکیم اپنے علم کے کمال اور زندگی کے پایان کار میں پہنچ جاتا ہے۔ یعنی مرتبۂ علم کی ہیچ میرزی، دانستہ نادانی، اور عالمانہ اقرارِ جہل جسے "لا ادریت" کہتے ہیں یعنی:

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد

خیام کی تصانیف حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) رسالۂ مکعبات —
(۲) رسالۂ جبر و مقابلہ
(۳) زیچ ملک شاہی
(۴) رسالۂ ما اشکل من صادرات اقلیدس
(۵) رسالۂ مختصر در طبیعیات
(۶) میزان الحکم
(۷) رسالۂ کون و تکلیف و رسالۂ اسئلۂ ثلاثہ
(۸) رسالۂ فی کلیات الوجود
(۹) رسالۂ موضوع علم کلی و وجود

(۱۰) رسالۂ اوصاف یا رسالۃ الوجود

(۱۱) عربی اشعار

(۱۲) رباعیات فارسی

(۱۳) مکاتباتِ خیامؔ

مندرجہ بالا فہرست سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خیامؔ اپنے زمانے کا ایک فقید المثال عبقری (جینئس) اور جامع صفات انسان تھا۔ لیکن چونکہ یہاں ہمیں عمر خیامؔ کی شاعرانہ عظمت اور فلسفیانہ افکار کا جائزہ لینا ہے لہٰذا مناسب یہی ہے کہ فلکیات اور ریاضیات کے ماہر کی حیثیت سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کے فلسفیانہ افکار کا پتہ لگائیں تاکہ ایک مفکّر اور شاعر کی حیثیت سے عمر خیامؔ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس لیے یہ مناسب ہوگا کہ ہم خیامؔ کے فلسفیانہ رسالوں میں سے ایک آدھ پر طائرانہ نظر ڈالیں۔

(۱) رسالۂ کون و تکلیف

یہ رسالہ ۱۹۱۷ء میں چھپ چکا ہے۔ اس کی تصنیف کا سبب یہ تھا کہ بوعلی سینا کے ایک شاگرد قاضی ابونصر نسوی نے ۴۷۳ھ (۱۰۸۱ء) میں خیامؔ سے دو سوال پوچھے تھے۔

(۱) خدا نے یہ دنیا اور خصوصاً انسان کو کیوں بنایا؟

(۲) اور انسان کو عبادات بجا لانے کی تکلیف کیوں دی؟

انہیں دو سوالوں کی وجہ سے اس رسالے کا نام "کون و تکلیف" پڑ گیا۔ پہلا سوال کون (ہستی) کی علّت سے اور دوسرا سوال تکلیف (احکامِ الٰہی) کی علّت سے ہے۔ خیامؔ

نے جواب کے آغاز میں سب سے پہلے یہ لکھا ہے کہ تمام فلسفہ کا نچوڑ تین سوالات ہیں۔

(۱) کیا یہ ہے؟ (اَنِیّۃ)

(۲) اگر ہے تو کیا ہے؟ (مَا ھو)

(۳) اور کیوں ہے؟ (لِمَ ھو)

پھر بتایا کہ وہ شے جو دنیا میں موجود ہے وہ انیّت (موجودیت) اور ماہویت (ماہیّت) سے کبھی خارج نہیں ہو سکتی۔ البتہ "لمیت" سے بعض وجود بے نیاز ہو سکتے ہیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ وجود کی دو قسمیں ہیں۔ ایک واجب الوجود اور دوسری ممکن الوجود۔

علّت اور سبب کا سوال ضرور ہے کہ کہیں جا کر رُکے اور ایک ایسی علّت پر جا کر انتہا ہو جس کی کوئی علّت نہ ہو۔ یہ شان واجب الوجود کی ہے۔ اور ممکن الوجود کے تمام اسباب و علل بالآخر عِلّت العلل یعنی اسی واجب الوجود پہ جا کر ختم ہوتے ہیں۔

واجب الوجود جس طرح اپنے وجود کی علّت سے بے نیاز ہے اسی طرح اس کے اوصاف و صفات اور افعال بھی علل و اسباب سے مستغنی ہیں۔ اِس لیے یہ سوال ہی بے معنی ہے کہ اس نے کیوں بنایا اور ہست کیا۔ یہ واجب الوجود کے جُود و کرم کی صفت کا نتیجہ ہے کہ یہ دنیا ہست ہے اور ہم موجود ہیں۔

اس کے بعد اس نے موجودات کی ترتیب اضافی کی فضیلت پر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ اس مسئلہ میں بہت سے لوگ سرگرداں ہیں۔

آگے چل کر وہ جو کچھ بیان کرتا ہے اس سے مسئلہ ارتقار کی جھلک نمودار

ہوتی ہے۔ وہ دراصل ابو علی سینا کی الٰہیات کی ترتیب بیان کرتا ہے کہ پہلے
عقل اوّل پیدا ہوئی پھر عقل دوّم اور فلک اوّل اور یہ سلسلہ عقل دہم اور فلک نہم
تک چلتا رہا۔ یہاں تک کہ مادّہ پر اس ابداع کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایجاد
کا دَور شروع ہوا۔ اس میں خام مرکبات ترتیب کے ساتھ پیدا ہوئے۔
معدنیات، جمادات، نباتات، حیوانات اور بڑھتے بڑھتے انسان پیدا ہوا اور فضیلت
اور بزرگی کی ترتیب نیچے سے اوپر کو چڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ انسان سب سے
افضل واشرف قرار پایا۔ اس لیے کہ وہ اپنی مادّی اصل سے سب سے دور ہے
اور مبدءِ اوّل سے روحانی طور پر قریب ہے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مادّی اشیاء ترتیباً کیوں پیدا ہوئیں؟ اس کے
جواب میں کہتا ہے کہ: تمام مادّی کائنات و موجودات آپس میں متضاد و متقابل
اشیاء ہیں۔ لہٰذا سب ایک ہی ساتھ پیدا نہیں ہو سکتے۔ ایک ہی کپڑا ایک ہی وقت
میں سپید و سیاہ دونوں نہیں ہو سکتا۔ دونوں رنگ یکے بعد دیگرے چڑھیں گے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیائے کون و فساد میں یہ تضاد کیوں؟ اس کا
جواب وہی دیا جو امام غزالی نے دیا ہے کہ عالم جس نہج پر پیدا ہوا ہے، اگر اس میں
کچھ شر یا نقص (تضاد) بھی ہے تو خیرِ کثیر کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے۔
بہت بھلائی سے تھوڑی سی برائی کے لازم آجانے کے خیال سے رک جانا بہت بڑی
برائی ہے۔

اسی لیے باری تعالیٰ ان تمام متضاد و متقابل ممکن ہستیوں کو باری باری
مُنصّہ وجود پر لاکر انصاف کے ساتھ ان میں سے ہر ایک کو کمالِ ذاتی حاصل کرنے کا

موقع عطا فرماتا ہے۔ اور ان میں جو تفاوت ہے وہ حق تعالیٰ کے بخل کرم کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی حکمتِ سرمدی کی وجہ سے ہے۔

اس کے بعد اس نے تکلیف کی حقیقت اپنے حکیمانہ انداز میں یوں بیان کی ہے کہ:

"تکلیف وہ فرمانِ الٰہی ہے جو اس لیے صادر کیا گیا ہے تاکہ وہ افرادِ انسانی کو ان کے ان دنیاوی و اخروی کمالات کی طرف عملاً لائے جن کی استعداد ان کے اندر رکھی گئی ہے اور ان کو ظلم و بے انصافی اور برائیوں کے ارتکاب اور نقائص کے اکتساب اور ان جسمانی خواہشوں کی پیروی سے باز رکھے جو ان کو عقلی قوت کی پیروی سے روکتی ہے۔"

اس کے بعد اس نے شریعت کی ضرورت اور نبوّت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس پر ہم کو نٹشے کے فوق البشر (Superman) کا دھوکا ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کو اس طرح بنایا ہے کہ اس کے افراد الگ الگ غیر محدود مدت تک زندہ نہیں رہ سکتے۔ جب تک موجودہ اور آئندہ نسلیں باہم مل کر ترقی کی کوششیں اسی طرح نہ کرتی چلی جائیں کمالِ نوعی حاصل نہیں ہو سکتا۔ نیز موجودہ تمام افرادِ انسانی باہم آپس میں تعاون اور تعاضد اور ایک دوسرے کی تمدنی و اجتماعی امداد کے بغیر زندگی کے ضروریات لباس، خوراک و مسکن وغیرہ کو پورا نہیں کر سکتے۔ اس طرح باہمی تعاون و امداد کے ایک منصفانہ عادلانہ دستور کی ضرورت پیش آتی ہے جس کا نام شریعت ہے۔

پھر نبوّت کی بحث آتی ہے کہ اس شریعتِ عادلہ کی حامل ایک ایسی

ہستی ہونی چاہیے جو تمام افرادِ انسانی سے زیادہ عاقل، زیادہ پاک و طاہر ہو۔ جو دنیاوی مہمات میں ملوث نہو، اس کی غرض و غایت دولت و ریاست کی محبت اور جاہ پسندی نہ ہو اور اپنے شہوانی اور غضبی جذبات پر اس کو پورا پورا قابو ہو۔ اور ہر کام میں اس کی غرض رضائے الہٰی کی طلب ہو۔ ایسا ہی شخص دستورِ انسانی یعنی شریعت کا حامل ہو سکتا ہے۔ تاکہ کسی طرف اور کسی خاص فرقہ اور جماعت کے حق میں اس کا پلّہ جھکنے نہ پائے اور اس کے حکم کی پیروی بادشاہ اور رعایا پر یکساں ضروری اور امیر و غریب دونوں پر یکساں حاوی ہو۔

اس کے بعد تکرارِ عبادت کی بحث ہے۔ اور اس سلسلے میں اس نکتہ کو ادا کیا ہے جو آج کی سائیکالوجی (نفسیات) کا مسلمہ مسئلہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ عبادات بار بار ادا کرنے کا حکم اس لیے ہے کہ:

"پس ان پر یہ مذکورہ بالا عبادت فرض کی گئی ہے اور یہ بار بار ان سے کرائی جاتی ہے تاکہ متواتر تکرار سے یہ یادگیری ان کے اندر مستحکم ہو جائے۔"

پھر کہتا ہے کہ ان اوامر بجالانے اور ان نواہی سے بچنے میں تین فائدے ہیں۔

(۱) نفس انسانی کا شہواتِ نفسانی سے احتراز کر کے قوت عقلیہ کو پرورش پانے کا موقع بہم پہنچانا۔

(۲) نفس کو امور الٰہیہ اور امورِ معاد و آخرت میں غور و فکر کا عادی بنانا تاکہ اس دارِ ناپائدار کے ظلمات سے نکل کر جنابِ حق اور ملکوتِ ربّانی کی طرف توجہ و التفات کی استعداد پیدا ہو۔ کہتا ہے:

"اور عبادت، نفسِ اوّل کو اس کے حقِ اول (خدا) کے وجود پر آمادہ کرتی ہے جس سے ہر موجود کا وجود ہے۔ اس کا ذکر بلند ہو اور اس کے نام مقدس ہوں جس کے سوا اور کوئی دوسرا معبود نہیں۔ جس سے موجودات کو وجود کا فیض اس سلسلۂ ترتیب میں منظم ہو کر ملا ہے۔ جس کا مطالبہ وہ سچی حکمت کرتی ہے جو ایسے قیاس پر مبنی ہے جو فریب اور مغالطے سے بری ہے۔"

(۳) تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اس عالم میں امن و امان، نظم و ضبط اور عدل و انصاف اور باہمی اجتماعی تعاون و مشارکت پیدا ہو اور نظامِ عالم حکمتِ ربّانی کے مطابق قائم رہے۔"

(۲) کون و تکلیف کا دوسرا رسالہ

کون و تکلیف کے دوسرے رسالے میں قاضی نسوی کے سوال پر عمر خیام نے مسئلہ تضاد (خیر و شر) پر مزید بحث کی ہے اور کہا ہے کہ خدا محض خالقِ خیر ہے۔ اس نے اشیاء کو پیدا کیا۔ دوسرے لوازم عرضاً پیدا ہو گئے جن میں نقص، شر یا تضاد شامل ہیں۔

(۳) جبر و قدر

اس رسالے میں خیام سے ایک نہایت اہم سوال کیا گیا ہے' اور وہ یہ کہ جبر و قدر کے مسئلہ میں کون فریق برسرِ حق ہے؟

یہاں خیّام لاجواب ہو جاتا ہے اور اس کا اندرونی فلسفہ اس پر غالب آجاتا ہے۔ اور دو سطروں میں نہایت چپکے سے یہ کہہ کر اتنے بڑے اہم سوال کی ذمّہ داری سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ :

" لیکن اس کا یہ سوال کہ ان دونوں فریقوں میں سے کون صواب سے قریب تر ہے تو شاید جبر کا قائل حق سے بظاہر زیادہ قریب ہے' اس شرط سے کہ وہ ہذیان میں یا وہ گوئی نہ کرے اور اپنے خرافات میں زیادہ دور تک نہ چلا جائے۔ ایسی حالت میں وہ حق سے دور ہو جائے گا۔"

لیکن خیاؔم سے منسوب ایسی کئی رباعیاں ہیں جن میں یہ خرافات موجود ہیں۔ مثلاً:

بر رہگذرم ہزار جا دام نہی	گوئی کہ بگیرمت اگر گام نہی
یک ذرہ ز حکم تو جہان خالی نیست	حکم تو کنی و عاصیم نام نہی

اس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ بہت ساری غیر خیامی رباعیاں بھی خیاؔم سے منسوب کر دی گئی ہیں۔

(۴) رسالۂ موضوعِ علمِ کلی

رسالۂ موضوعِ علمِ کلی میں وجود پر بحث ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ " خالص عقلی علم نہ ہم کو ہوا ہے' نہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ ہمارے تمام معقولات تخیل آمیز ہوتے ہیں اور تخیل صرف جزئی کا ادراک کر سکتا ہے۔"

اس کے بعد خیاؔم کہتا ہے کہ:

" کمال تک پہنچنے کے لیے خدا سے توفیق کی بھیک مانگتا ہوں اور ہر حال میں خدا کا مشکور ہوں۔"

اس رسالے کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عمر خیاؔم کو مسئلہ توحید کی اہمیت اور خدائے تعالیٰ کی عظمت و بزرگی پر کتنا یقین تھا اور وہ اپنے فلسفیانہ

تصوّف کے راستے سے اپنے مقصد تک پہنچنے کی کتنی اُمنگ رکھتا تھا۔

(۵) رسالۃُ فی الوجود

خیّام نے نظام الملک کے فرزند فخر الملک (سلجوقی وزیر) کی درخواست پر ایک رسالہ لکھا جس میں وجود پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

(رسالۃُ فی الوجود) اس سے خیّام کے دو اصولی عقیدوں کا پتہ چلتا ہے۔

(الف) وہ کہتا ہے کہ خدا نے وجود کو دو حصّوں میں پیدا کیا۔ ایک ملکوتی یا غیر مادّی کائنات (عقول ونفوس) دوسرا مادی کائنات (نباتات، جمادات، حیوانات اور انسان) تقرّب الٰہی کے لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے میں ملکوتی صفات پیدا کرے اور خود کو ان کے جیسا بنائے۔ ان کا تقرّب جنّت اور ان سے دوری دوزخ ہے۔

(ب) اس رسالے سے خیّام کا دوسرا اصولی خیال یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ متکلمین کے مناظرانہ اور حکماء کی فلسفیانہ شعبدہ بازی اور نکتہ پروری کے طلسم کو بے اثر سمجھ چکا تھا اور تصوف کے دریچۂ اشراق سے جھانک تاک کے نظاروں کا اس کو چسکا پڑ رہا تھا چنانچہ اس رسالے کے آخری باب میں وہ کہتا ہے:

"معلوم ہونا چاہیے کہ عرفانِ حق کے طلبگاروں کے چار گروہ ہیں۔

(۱) اول متکلمین کا گروہ۔ یہ بحث ومباحثہ ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور اس سے آگے نہیں جاتے نتیجہ ظاہر ہے۔

(۲) دوسرا گروہ فلاسفر اور حکماء کا ہے جو عقلیات اور منطقی قوانین کے

ذریعے حقیقت کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور بالآخر عجز و ناکامی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے خرد کیا ہے؟ چراغِ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے

(علامہ اقبال)

(۳) تیسرے اسماعیلی باطنی ہیں، جن کا عقیدہ ہے کہ معرفت اخبارِ مخبرِ صادق کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ تمام مسائل کا حل "قولِ صادق" کے ذریعے ملے گا۔

(۴) چوتھا گروہ اہلِ تصوف کا ہے۔ یہ گروہ عقل و فکر کی بجائے دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں اور وہ ہے تصفیہٗ باطن، تزکیہٗ نفس اور تہذیبِ اخلاق کا اور اس طرح اپنے جسم خاکی اور دل و دماغ کو کدورتوں سے پاک کر کے ان کو نورِ الٰہی کا آئینہ بناتے ہیں۔ ان کا دل ایسا طور بن جاتا ہے جہاں تجلّیاتِ الٰہی جلوہ گر ہوتے ہیں۔

لہٰذا اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ آخری طریقہ سب سے اعلیٰ اور افضل ہے"

مذکورہ بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ خیّام متکلمانہ مناظروں، حکیمانہ دلیلوں اور حصولِ تسکین کے اسماعیلی باطنی طریقوں سے تشفی نہ پاکر تصوف کے مشاہدات و انوار سے فیض چاہتا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ خیّام کے اس آخری باب میں جو کچھ اختصار کے ساتھ ہے وہی امام غزالی کی "منقذ من الضلال" میں شرح و تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اکثر اہلِ نظر اسی ایک راستے سے تصوف کے مقام پر پہنچے تھے۔

آمد سحری ندا ز میخانۂ ما
کای رندِ خراباتی و دیوانۂ ما
برخیز کہ پُر کنیم پیمانہ زمیٔ
زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

۱

میخانے سے ہنگامِ سحر آئی ندا
اے بے خبرِ عمرِ رواں جاگ ذرا
پیمانۂ ہستی نہ چھلک جائے کہیں
ہاں جام اُٹھا، جام اُٹھا، جام اُٹھا

گر می نخوری طعنہ مزن مستان را

گر دست دہد توبہ کنم یزدان را

تو فخر بدین کنی کہ من می نخورم

صد کار کنی کہ می غلام است آن را

۲

میخواری کا واعظ ہمیں طعنہ مت دے

ہم توبہ بھی کرلیں گے خُدا گر چاہے

مانا کہ تو میری طرح میخوار نہیں

ہر کام ہے لیکن تِرا بدتر مے سے

ہر چند کہ رنگ و روی زیباست مرا
چون لالہ رُخ و چو سرو بالاست مرا
معلوم نشد کہ در طربخانۂ خاک
نقّاشِ من از بہرِ چہ آراست مرا

۳

ہاں! سرو صفت قامتِ رعنا ہے مرا
پھولوں کی طرح چہرۂ زیبا ہے مرا
حیراں ہوں کہ عشرت کدۂ فانی میں
نقّاش نے کیوں نقش بنایا ہے مرا

برخیز و بیا بتا برای دلِ ما

حل کن بجمالِ خویشتن مشکلِ ما

یک کوزۂ می بیار تا نوش کنیم

زان پیش کہ کوزہا کنند از گلِ ما

۴

ہاں ساز اٹھا اور سُنا اے ساقی

اِک نغمۂ اندوہ رُبا اے ساقی

قبل اس سے کہ کوزے میں ڈھلے خاک اپنی

لا کوزۂ مے اور پلا اے ساقی

چون در گذرم بباده شوئید مرا
تلقین ز شرابِ ناب گوئید مرا
خواہید بروزِ حشر یابید مرا
از خاکِ درِ میکدہ جوئید مرا

۵

مرنے پہ مئے ناب سے نہلائیے گا
تلقین مئے و جام سے فرمائیے گا
اور حشر کے دن مجھ سے جو ملنا چاہیں
میخانے کی مٹّی میں مجھے پائیے گا

خواہی ز فراق در فغان دار مرا

خواہی ز وصال شادمان دار مرا

من با تو نگویم کہ چسان دار مرا

زان ساں کہ دلت خواست چنان دار مرا

٦

صحرائے تمنّا میں مجھے پیاسا رکھ

یا بحرِ تجلّی میں گہر جیسا رکھ

مجھ سے مری مرضی مرے مولا مت پوچھ

جیسی تری مرضی ہو مجھے ویسا رکھ

ای آنکه گزیدۂ جہانی تو مرا
خوشتر ز دل و دیدہ و جانی تو مرا
از جان صنما عزیزتر چیزی نیست
صدبار عزیزتر ازانی تو مرا

۷

ہر شے سے ہر اک خواہش و ارماں سے عزیز
اے جانِ جہاں تو ہے دل و جاں سے عزیز
جاں سے بھی عزیز تر ہے ایماں لیکن
واللہ تو سو بار ہے ایماں سے عزیز

چون عہدہ نمی شود کسی فردا را

حالی خوش دار این دلِ پُرسودا را

مَی نوش بماہتاب ای ماہ کہ ماہ

بسیار بتابد و نیابد ما را

۸

یہ مہکی ہوئی چاندنی اے زہرہ جبیں

دے جام کہ فردا کا نہیں کوئی یقیں

یہ ماہِ حسیں کل بھی فلک پر ہوگا

ڈھونڈے گا بہت پر ہمیں پائے گا نہیں

ای دلِ ز زمانہ رسمِ احسان مطلب
وز گردشِ دوران سر و سامان مطلب
درمان طلبی دردِ تو افزون گردد
با درد بساز و ہیچ درمان مطلب

۹

دنیا سے عبث ہے سر و ساماں کی طلب
اور گردشِ ایّام سے احساں کی طلب
درماں کی طلب درد بڑھا دیتی ہے
رہ درد بجاں چھوڑ دے درماں کی طلب

بابط می گفت ماہیِ درتب وتاب

باشد کہ بجوی رفتہ باز آید آب

بط گفت کہ چو من وتو گشتیم کباب

دنیا پسِ مرگِ ما چہ دریا چہ سراب

۱۰

مچھلی نے کہا بط سے نہ ہو یوں بے تاب

برسات میں ہو گی یہ ندی پھر سیراب

بط بولی کہ اس وقت جو ہم ہی نہ ہوئے

کیا فرق یہ دنیا ہو سمندر کہ سراب

چندان بخورم شراب کہ این بوی شراب

آید ز تراب چون روم زیر تراب

گر بر سرِ خاکِ من رسد مخموری

از بوی شرابِ من شود مست و خراب

۱۱

اس درجہ ہمیشہ رہوں غرقِ مئے ناب

مرجاؤں تو تربت سے اُٹھے بوئے شراب

آجائے جو تربت پہ بلانوش کوئی

مخمور فضا سے ہو وہیں مست و خراب

آبادیِ میخانہ زمَی خوردنِ ماست

خونِ دو ہزار توبہ درگردنِ ماست

گرمن نکنم گناہ رحمت چہ کند

آرائشِ رحمت ازگنہ کردنِ ماست

۱۲

میخانے کی رونق ہے مِری مَے نوشی

ہے شہرۂ عالم مِری توبہ شکنی

کیا حال ہو رحمت کا گناہوں کے بغیر

آرائشِ رحمت ہیں خطائیں میری

آں بہ کہ در زمانہ کم گیری دوست

با اہلِ زمانہ صحبت از دور نکوست

آں کس کہ بجملگی ترا تکیہ بدوست

چوں چشمِ خرد باز کنی دشمنت اوست

۱۳

بہتر ہے کسی کو نہ یہاں دوست بنا

لوگوں سے فقط دُور کا رشتہ اچھا

تو دوست سمجھتا ہے بظاہر جس کو

دراصل وہی دوست ہے دشمن تیرا

آن قصر کہ جمشید درو جام گرفت

آہو بچہ کرد و روبہ آرام گرفت

بہرام کہ گور می گرفتی ہمہ عمر

دیدی کہ چگونہ گور بہرام گرفت

۱۴

دنیا کے لیے عمر عبث کھوتا ہے

جمشید کا ایوان بھی کھنڈر ہوتا ہے

بہرام کہ کرتا تھا سدا گور شکار

وہ گور میں امروز پڑا سوتا ہے

آن کس کہ بخوبان لبِ خندان دادست

خونِ جگری بدرد مندان دادست

گر قسمتِ ماند ادشادی غم نیست

شادیم کہ غم ہزار چندان دادست

۱۵

مہ رُویوں کو جس نے لبِ خنداں بخشا

اور اہلِ جنوں کو دلِ سوزاں بخشا

کیا غم جو خوشی اپنے مقدّر میں نہیں

خوش ہیں کہ ہمیں رنجِ فراواں بخشا

ابر آمد و باز بر سر سبزہ گریست
بی بادۂ گلرنگ نمی باید زیست
این سبزہ کہ امروز تماشہ گہِ ماست
تا سبزۂ خاکِ ما تماشا گہِ کیست

۱۶

یہ ابرِ گہربار یہ گلرنگ فضا
بے ساقی و مے ایسے میں جینا کیسا
ہے اب جو تماشا گہِ عالم سبزہ
کل خاک سے اپنی بھی یہ پیدا ہوگا

از منزلِ کفر تا بدین یک نفس است
وز عالمِ شک تا بہ یقین یک نفس است
این یک نفسِ عزیز را خوش میدار
چون حاصلِ عمرِ ما همین یک نفس است

۱۷

ہے فاصلۂ شک و یقیں ایک نفس
اور کفر سے منزل گہِ دیں ایک نفس
اس ایک نفس پر ہے مدارِ ہستی
خوش باش کہ ہے عمرِ حسیں ایک نفس

امروز کہ نوبتِ جوانیِ من است

مَی نوشم ازاں کہ کامرانیِ من است

عیبش مکنید گرچہ تلخ است خوش است

تلخ است ازاں کہ زندگانیِ من است

۱۸

امروز کہ معراج جوانی ہے مری

ہاں جام پیئیں کہ کامرانی ہے مری

تم عیب لگاتے ہو کہ ہے تلخ شراب

کیوں تلخ نہ ہو کہ زندگانی ہے مری

ای بیخبر این جسمِ مجسّم ہیچ است
وین دائرہ و سطحِ مخیّم ہیچ است
دریاب کہ در کشاکشِ موت و حیات
وابستہ یک دمیم و آن ہم ہیچ است

(۱۰۹)

یہ جسمِ مجسّم کہ ہے آدم، ہے ہیچ
یہ ارض و مہ و مہر کا عالم ہے ہیچ
ہے کشمکشِ موت و حیات اک دم سے
یہ رشتۂ دم بھی مرے ہمدم ہے ہیچ

ای چرخِ فلک خرابی از کینۂ تُست

بیدادگری پیشۂ دیرینۂ تُست

ای خاک اگر سینۂ تو بشگافند

بس گوہرِ قیمتی کہ در سینۂ تُست

٢٠

اے چرخ قیامت کا ہے کینہ تیرا

اِک جورِ مسلسل ہے قرینہ تیرا

خوں گشتہ نظر آئیں گے گوہر لاکھوں

اے خاک کریں چاک جو سینہ تیرا

ای دلِ چو زمانہ می کند غمناکت
ناگہ برود زتن روانِ پاکت
بر سبزہ نشین و خوش بزی روزی چند
زان پیش کہ سبزہ بردمد از خاکت

۲۰۱

تلخابۂ ہستی بھی گوارا کر لے
کیا جانیے کب جان جُدا ہو تن سے
آ بیٹھ کے سبزے پہ منا جشنِ طرب
قبل اس سے کہ مٹی سے تری سبزہ اُگے

ای دِل چو نصیبِ تو ہمہ خون شدن است

احوالِ تو ہر لحظہ دگر گون شدن است

ای جان تو درین تنم چہ کار آمدۂ

چون عاقبتِ کارِ تو بیرون شدن است

۲۲۰

اے دِل کہ سدا خوں میں نہانا ہے تجھے

ہر آن نیا داغ اُٹھانا ہے تجھے

اے جان تو کس واسطے تن میں آئی

اِک روز جو تن چھوڑ کے جانا ہے تجھے

ای مردِ خرد حدیثِ فردا ہوس است

در دہر زدن لافِ سخنہا ہوس است

امروز چنین ہر کہ خردمند کس است

داند کہ ہمہ جہان چنین یک نفس است

۲۳

یہ قحبۂ دنیا، یہ غلامانِ ہوس

گھورے پہ مگس، لاش پہ جیسے کرگس

اے نشۂ دولت میں بہکنے والو!

یہ عالمِ فانی ہے فقط ایک نفس

این کہنہ رباط را کہ عالم نام است
وآرام گہِ ابلقِ صبح وشام است
بزمیست کہ واماندۂ صد جمشید است
قصریست کہ تکیہ گہِ صد بہرام است

۲۴

جز مرگ نہیں زیست کا انجام یہاں
ہر شے ہے شکارِ سحر و شام یہاں
ٹوٹے ہیں یہاں سیکڑوں جامِ جمشید
ہیں خاک بسر سیکڑوں بہرام یہاں

ای وای بر آن دل که درو سوزی نیست
سودا زدهٔ مهرِ دل افروزی نیست
روزی که تو بی عشق بسر خواهی کرد
ضائع ترا نه آن روز ترا روزی نیست

۲۰۵

اِنساں نہیں دِل میں اگر سوز نہیں
جاں باختۂ حسنِ دل افروز نہیں
وہ روز جو محرومِ تب و تاب رہے
بیکار ترا اس سے تو کوئی روز نہیں

گویند کسان بہشت با حور خوش است
من می گویم آبِ انگور خوش است
این نقد بگیر و دست ازان نسیہ بشوی
کآوازِ دہل شنیدن از دور خوش است

۲۰۶

مشتاق وہ جنّت میں لبِ حور کے ہیں
دِل باختہ ہم دخترِ انگور کے ہیں
ہاں نقد نہ کھو وعدۂ فردا پہ نہ جا
یہ ڈھول سہانے تو فقط دُور کے ہیں

ہر سبزہ کہ بر کنارِ جوئی رستہ است
گوئی ز لبِ فرشتہ خوئی رستہ است
پا بر سرِ سبزہ بخواری نہ نہی
کاں سبزہ ز خاکِ لالہ روئی رستہ است

۲۷

گلشن میں یہ گلہائے بہاراں اے دوست
گل ہیں کہ لبِ لالہ عذاراں اے دوست
سبزے کو تو اس طرح سے ٹھکرا کے نہ چل
دراصل یہ ہے خاکِ نگاراں اے دوست

بسیار بگشتیم بگردِ در و دشت
اندر ہمہ آفاق بگشتیم و بگشت
از کس نشنیدیم کہ آمد زین راہ
راہی کہ برفت راہرو بازنگشت

۲۸

اسرار کے پردوں کو اُٹھاتا کوئی
اور بعدِ فنا کیا ہے بتاتا کوئی
دنیائے عدم کے تو مسافر ہیں سبھی
اے کاش مگر لوٹ کے آتا کوئی

می خور که بزیرِ گِل بسی خواہی خفت
بی مونس و بی رفیق و بی ہمدم و جفت
زنہار بکس مگو تو این رازِ نہفت
ہر لالہ کہ پژمُرد نخواہد بشگفت

۲۹

پی بادہ کہ سونا ہے تجھے زیرِ زمیں
پھر جام و سبو ہوں گے نہ ساقیِ حسیں
آئے گا نہ پھر لوٹ کے یہ دورِ طرب
مُرجھائے ہوئے پھول بھی کھلتے ہیں کہیں

این کوزہ چو من عاشقِ زاری بودہ است
در بندِ سرِ زلفِ نگاری بودہ است
این دستہ کہ در گردنِ او می بینی
دستی ست کہ در گردنِ یاری بودہ است

۳۰

یہ کوزۂ گِل عاشقِ کامل تھا کبھی
اور زلفِ گرہ گیر پہ مائل تھا کبھی
یہ دستۂ کوزہ تھا کبھی دستِ جواں
اور گردنِ ساقی میں حمائل تھا کبھی

بر چہرۂ گُل شبنمِ نوروز خوش است
در طرفِ چمن روی دل افروز خوش است
از دِی کہ گذشت ہر چہ گوئی خوش نیست
خوش باش وز دِی مگو کہ امروز خوش است

پھولوں پہ جو ہے شبنمِ نوروز ہے خوب
گلشن میں رُخِ یارِ دل افروز ہے خوب
ہاں گزرے ہوئے کل کا نہ کر ذکر کوئی
خوش باش تو امروز کہ امروز ہے خوب

دارندہ چو ترکیبِ طبائع آراست
از بہر چہ او فگندش اندر کم و کاست
گر نیک آمد شکستن از بہرِ چہ خواست
ور نیک نیامد این صور عیب کراست

۳۲

نقّاش کا ہر نقش ہی فریادی ہے
کیوں فرق ہے کیوں ان میں کمی بیشی ہے
گر خوب ہیں پھر ان کو مٹاتا کیوں ہے
گر خوب نہیں ہیں تو خطا کس کی ہے

یک جرعهٔ می ز ملکِ کاؤس بہست
وز تختِ قباد و مسندِ طوس بہست
ہر آہ کہ عاشق بہ سحرگاہ کشد
از نالۂ زاہدانِ سالوس بہست

(۳۳)

اِک جرعۂ مے ہے ملکِ کاؤس سے خوب
اورنگِ قباد و مسندِ طوس سے خوب
عاشق کی زباں پر جو ہے آہِ سحری
ہے نالۂ صد زاہدِ سالوس سے خوب

در ہر دشتی کہ لالہ زاری بودست
آن لالہ ز خونِ شہریاری بودست
ہر برگِ بنفشہ کز زمین می روید
خالی ست کہ بر رخِ نگاری بودست

۳۴

صحرا میں جو ہے یہ لالہ زار اے ساقی
دراصل ہے خونِ شہریار اے ساقی
یہ برگِ بنفشہ جو زمیں سے پھوٹا
ہے خالِ رخِ لالہ عذار اے ساقی

ساقی گل و سبزہ بس طربناک شدست
دریاب کہ ہفتۂ دگر خاک شدست
می نوش و گلی بچین تا در نگری
گل خاک شدست و سبزہ خاشاک شدست

۳۵

ساقی گل و سبزہ کہ طربناک ہوئے
دو دن میں غضب ہے خس و خاشاک ہوئے
ہاں جام اُٹھا دیکھ کہ گلہائے حسیں
کھلنے بھی نہ پائے تھے کہ بس خاک ہوئے

با بادہ نشیں کہ ملکِ محمود این است
از چنگ شنو کہ لحنِ داؤد این است
از نامدہ و رفتہ دگر یاد مکن
حالی خوش باش زانکہ مقصود این است

(۳۶)

ہاں جام اٹھا کہ ملکِ محمود ہے یہ
سُن سازِ طرب کہ لحنِ داؤد ہے یہ
امروز غمِ ماضی و فردا ہے غلط
خوش باش کہ بس زیست کا مقصود ہے یہ

بر لوح نشانِ بودنی ہا بود است
پیوستہ قلم زنیک و بد فرسود است
اندر تقدیر ہر چہ بایست بداد
غم خوردن و کوشیدنِ ما بیہود است

(۳۷)

جو ہونا ہے جو کچھ بھی ہوا ہے اے دوست
وہ لوحِ مقدر پہ لکھا ہے اے دوست
اب لاکھ جتن جراٴتِ تدبیر کرے
تقدیر کا لکھا بھی مٹا ہے اے دوست

تا ہشیارم در طرب نقصان است
چون مست شوم خرد ز من پنہان است
حالی ست میانِ مستی و ہشیاری
من بندۂ آن کہ زندگانی آن است

(۳۸)

مستی تو خرد پر ہے وبال اے ساقی
اور ہوش ہے مستی پہ زوال اے ساقی
جس حال میں مستی بھی ہو ہشیاری بھی
انساں کی ہے معراجِ کمال اے ساقی

برتر ز سپہر خاطرم روزِ نخست

لوح و قلم و دوزخ و جنّت می جست

پس گفت مرا معلّم از رای درست

لوح و قلم و بہشت و دوزخ باتست

۳۹

تھی روزِ ازل ہم کو حقیقت کی تلاش

لوح و قلم و دوزخ و جنّت کی تلاش

آئی یہ ندا کیجے جہانِ دل میں

لوح و قلم و دوزخ و جنّت کی تلاش

تا کی ز چراغِ مسجد و دودِ کنشت

تا چند زیانِ دوزخ و سودِ بہشت

رو بر سرِ لوح بین کہ استادِ قضا

اندر ازل آنچہ بودنی بود نوشت

۴۰

کیوں عمر سرِ دیر و حرم کھوتا ہے

کیوں جنّت و دوزخ کے لیے روتا ہے

جو روزِ ازل لوح پہ مرقوم ہوا

اے دوست بہر حال وہی ہوتا ہے

بیگانہ اگر وفا کند خویشِ من است

در خویش جفا کند بد اندیشِ من است

گر زہر موافقت کند تریاق است

در نوش مخالف کند نیشِ من است

(۴۰۱)

بیگانہ جو کرتا ہے وفا خویش سمجھ

جو خویش جفا جو ہو بد اندیش سمجھ

گر زہر موافق ہو تو ہے وہ تریاق

نوشینہ ہو گر ضرر رساں نیش سمجھ

جامی و مئی و ساقیٔ برلبِ کشت

این جملہ مرا نقد و ترا نسیہ بہشت

مشنو سخنِ بہشت و دوزخ از کس

کہ رفت بدوزخ وکہ آمد زبہشت

۴۲

یہ گُل یہ سبو اور یہ حسیں اے واعظ

یہ سب ہیں تو جنّت ہے یہیں اے واعظ

ہاں جنّتِ فردا ہو مبارک تجھ کو

گر تجھ کو ہے فردا کا یقیں اے واعظ

چندین غمِ مال و حسرتِ دنیا چیست
ہرگز دیدی کسی کہ جاوید بزیست
این یک دو نفس کہ در تنت عاریتی ست
با عاریتی عاریتی باید زیست

۴۳

اتنا غمِ سرمایۂ دنیا کیا ہے
کب زندۂ جاوید کوئی رہتا ہے
یہ چند نفس عاریتاً تجھ کو مِلے
قرض اِن کو سمجھ کر ہی تجھے جینا ہے

خاری کہ بزیرِ پای ہر حیوانی ست
زلفِ صنمی و ابروی جانانی ست
ہر خشت کہ بر کنگرۂ ایوانی ست
انگشتِ وزیری و سرِ سلطانی ست

۴۴

یہ خارِ زمیں ابروے جاناں تو نہیں
گیسوے پریشانِ نگاراں تو نہیں
یہ خشت کہ ہے کنگرۂ ایواں میں
انگشتِ وزیر اور سرِ سلطاں تو نہیں

بنگر ز صبا دامنِ گل چاک شدست
بلبل ز جمالِ گل طربناک شدست
در سایۂ گل نشین کہ بسیار این گل
از خاک بر آمد و در خاک شدست

۴۵

ہنگامِ سحر دامنِ گل چاک ہوئے
گلشن کے عنادل بھی طربناک ہوئے
آ انجمنِ گل میں کہ سَو بار یہ گل
پیدا بھی ہوئے خاک سے اور خاک ہوئے

چون آب بجویبار و چون باد بدشت
روزِ دگر از عمرِ من و تو بگذشت
تا من باشم غمِ دو روزہ نخورم
روزی کہ نیامدست و روزی کہ گذشت

(۴۶)

مانندِ صبا و موجِ دریا ساقی
اِک اور بھی دن عمر کا گزرا ساقی
خوش باش کہ ہے مشربِ رنداں میں حرام
ماضی کا قلق اور غمِ فردا ساقی

این بحرِ وجود آمده بیرون ز نہفت

کس نیست کہ این گوہرِ تحقیق بسُفت

ہر کس سخنی از سرِ سودا گفتند

زان روی کہ ہست کس نمی داند گفت

۴۷

ہستی کی حقیقت کو کوئی پا نہ سکا

اسرارِ ازل کوئی بھی سمجھا نہ سکا

کس طرح عدم سے ہوا پیدا یہ جہاں

اس گتھی کو اب تک کوئی سلجھا نہ سکا

تا چند زنیم بروی دریا ہا خشت
بیزار شدم زبت پرستان و کنشت
خیّام کہ گفت دوزخی خواہد بود
کہ رفت بدوزخ و کہ آمد ز بہشت

(۴۸)

کیا روکیں گے سیلاب کو بندِ گل و خشت
یہ دیر و حرم اور کلیسا و کنشت
خیّام کو دوزخ سے ڈرانے والے
دیکھی ہے کسی نے بھی جہنّم و بہشت

چون آمدنم بمن نبُد روزِ نخست
وین رفتن بی مرادو عزمی ست درست
بر خیز و میان ببند ای ساقیِ چست
کاندوهِ جهان بمَی فرو خواهی شست

۴۹

لازم سہی دنیا میں بھی آئے اِنساں
اور لاکھ نہ چاہے تو بھی جائے اِنساں
ہاں جامِ طرب اُٹھا کہ لازم تو نہیں
بارِ غمِ ہستی بھی اُٹھائے اِنساں

تا باز شناختم من این پائے ز دست
این چرخِ فرو مایہ مرا دست بہ بَست
افسوس کہ در حساب نخواہند نہاد
عمری کہ مرا بی مَی و معشوق گذشت

۵۰

جب عقل تمیزِ دست و پا کرنے لگی
ناگاہ مِرے پاؤں میں زنجیر پڑی
افسوس کہ دینا ہے حساب اس کا بھی
"جو عمر مِری بے مَے و معشوق کٹی"

مَی خوردنِ من نہ ازبرای طرب است
نی بہرِ فساد و ترکِ دین و ادب است
خواہم کہ بہ بیخودی بر آرم نفسی
مَی خوردنم و مست بودن زین سبب است

۵۱

مَے نوشی سے مطلوب نہیں عیش و طرب
مقصود نہیں ترک کروں دین و ادب
ہاں عالمِ بے خودی میں کچھ وقت کٹے
بس اس کے سوا اور نہیں کوئی سبب

از گردشِ چرخ ہیچ مفہوم نیست
جز رنجِ زمانہ ہیچ موہوم نیست
ہر چند بکارِ خویش در می نگرم
عمری بگذشت و ہیچ معلوم نیست

۵۲

اِس گردشِ دوراں کا نہیں کچھ مفہوم
سوچو تو یہاں کی ہے ہر اک شے موہوم
جب دانشِ عالم کو ٹٹولا ہم نے
معلوم ہوا یہ کہ نہیں کچھ معلوم

دنیا دیدی و ہر چہ دیدی ہیچ است
و آن نیز کہ گفتی و شنیدی ، ہیچ است
سرتاسر آفاق دویدی ، ہیچ است
و آن نیز کہ در خانہ خزیدی ، ہیچ است

۵۳

دنیا ہو کہ دنیا کا تماشا سب ہیچ
جو کچھ بھی سنا اور سنایا سب ہیچ
آفاق میں بھٹکا کہ فلک پر پہنچا
یا گوشۂ تنہائی میں بیٹھا سب ہیچ

چون مردنِ تو مردنِ یکبارگی است
یکبار بمیر این چہ بیچارگی است
خونی و نجاستی و مشتی رگ و پوست
درکار نبود، این چہ غمخوارگی است

(۵۴)

مرنا ہے جو اک بار تو ڈرنا کیسا
اور خوف سے ہر لمحہ یہ مرنا کیسا
تو خون و نجاست کے سوا کچھ بھی نہیں
دم ایسی سبک جنس کا بھرنا کیسا

من بندهٔ عاصیم رضای تو کجاست
تاریک دلم نورِ صفای تو کجاست
ما را تو بہشت اگر بطاعت بخشی
این مزد بود لطف و عطای تو کجاست

۵۵

عاصی ہوں، مجھے تیری رضا ہے مطلوب
تاریک ہے دِل [illegible]رِ صفا ہے مطلوب
طاعت کے عوض خلد یہ اُجرت کیسی
مجھ کو تو فقط تیری عطا ہے مطلوب

بس خونِ کساں کہ چرخِ بیباک بریخت
بس گل کہ برآمد از گل پاک بریخت
بر حُسن و جوانی اے پسر غرّہ مشو
بس غنچہ ناشگفتہ برخاک بریخت

(۵۶)

اس چرخِ جفا جو نے بہت خون کیے
شاخوں پہ جہاں پھول کھلے نوچ لیے
مغرور جواں دیکھ کہ غنچے کتنے
کھلنے بھی نہ پائے تھے کہ بس خاک ہوئے

صحرا رخِ خود ز ابرِ نوروز بشُست
این دہرِ شکستہ دل بہ تو گشت درست
با سبزہ خطی و سبزہ زاری می خور
بر یادِ کسی کہ سبزہ از خاکش رست

٥٧

بادل نے برس کر رخِ صحرا دھویا
گلرنگ ہے ماحول تو پر کیف فضا
آ بیٹھ کے سبزے پہ پئیں اس کے نام
یہ سبزہ ہوا خاک سے جس کی پیدا

چون ابر بنوروز رخِ لاله بشست

برخیز و بجام بادہ کن عزم درست

کاین سبزہ کہ امروز تماشاگہِ تست

فردا ہمہ از خاکِ تو برخواہد رست

۵۸

یہ ابر یہ گل اور یہ طوفانِ بہار

لا ساغرِ نوروز مری جانِ بہار

کل خاک سے اپنی بھی نمایاں ہوں گے

یہ غنچہ و گل اور یہ لنگارانِ بہار

طور یست کہ صد ہزار موسیٰ دیدست

دیریست کہ صد ہزار عیسیٰ دیدست

قصریست کہ صد ہزار قیصر بگذشت

طاقیست کہ صد ہزار کسریٰ دیدست

اس طور نے دیکھے ہیں ہزاروں موسیٰ

اس دیر میں آئے ہیں ہزاروں عیسیٰ

اس قصر میں بیٹھے ہیں ہزاروں قیصر

اس تخت سے اٹھے ہیں ہزاروں کسریٰ

ای آمده از عالمِ روحانی تفت
حیران شده در پنج و چہار و شش و ہفت
مَی خور کہ ندانی ز کجا آمدۂ
خوش باش ندانی بکجا خواہی رفت

٦٠

اِنساں کے لیے ایک معمّا ہے جہاں
معلوم نہیں کس لیے آیا ہے یہاں
کھلتا نہیں یہ بھی کہ کہاں سے آیا
یہ بھی نہیں معلوم کہ جائے گا کہاں

در یاب کہ از روح جدا خواہی رفت

در پردۂ اسرارِ فنا خواہی رفت

مَی نوش ندانی زکجا آمدہ ای

خوش باش ندانی بکجا خواہی رفت

٦١

اِک روز تجھے بے تن وجاں جانا ہے

اسرار کی دنیا ہے جہاں جانا ہے

مَے پی نہیں معلوم کہاں سے آیا

خوش باش خدا جانے کہاں جانا ہے

ای چرخِ فلک خرابی از کینهٔ تُست
بیدادگری پیشهٔ دیرینهٔ تُست
ای خاک اگر سینۂ تو بشگافند
بس گوھرِ قیمتی کہ در سینهٔ تُست

٦٢

اے چرخ قیامت کا ہے کینہ تیرا
اِک جورِ مسلسل ہے قرینہ تیرا
خوں گشتہ نظر آئیں گے گوہر لاکھوں
اے خاک کریں چاک جو سینہ تیرا

در عالمِ بیوفا که منزلگهِ ماست

بسیار بجستم بقیاسی که مراست

چون روی تو ماه نیست روشن گفتم

چون قدّ تو نیست سرو می گویم راست

٦٣

ہر گوشۂ آفاق کو ہم نے چھانا

کوئی ترا ثانی نہ مقابل پایا

مہتاب ترے رخ کی ضیا مانگے ہے

اور سرو بھی چاہے ترے قامت کی ادا

با مطرب و مَی حور سرشتی گر ہست
با آبِ روان و لبِ کشتی گر ہست
بہ زین مطلب، دوزخِ فرسودہ متاب
حقّا کہ جز این نیست بہشتی گر ہست

(٦٤)

یہ جام و مَے و مطربۂ حور سرشت
یہ آبِ رواں اور یہ حسیں سبزۂ کشت
گر یہ ہیں تو اندیشۂ فردا ہے غلط
واللہ نہیں اس کے سوا کوئی بہشت

یزدان چو گِلِ وجودِ مارا آراست
دانست زفعلِ ماچہ خواہد برخاست
بی حکمش نیست ہر گناہی کہ مراست
پس سوختنِ قیامت ازبہرِ چہ خواست

٦٥

وہ جس نے مجھے خاک سے تخلیق کیا
اعمالِ جہانی سے مِرے واقف تھا
بے حکم نہیں جبکہ مِرا کوئی گناہ
پھر روزِ قیامت یہ جلانا کیسا

خیّام تنت بہ خیمہ می ماند راست
جان سلطانی کہ منزلش دارِ بقاست
فرّاشِ اجل ز بہرِ دیگر منزل
این خیمہ بیفگند چو سلطان برخاست

٦٦

خیّام ترا جسم ہے خیمے جیسا
سلطان ہے روح اس کی منزل ہے بقا
جب منزلِ نو کے لیے سلطان چلا
فرّاشِ اجل نے بھی گرایا خیمہ

خیّام کہ خیمہای حکمت می دوخت

در کورۂ غم فتاد و ناگاہ بسوخت

مقراضِ اجل طنابِ عمرش چو برید

دلّالِ قضا برائیگانش بفروخت

٦٧

ہاں خیمۂ حکمت جو سیا کرتا تھا

آتش کدۂ غم میں وہ خیّام جلا

ہستی کی طنابیں جو اجل نے کاٹیں

دلّالِ قضا نے بھی اسے بیچ دیا

در فصلِ بہار اگر بُتی حور سرشت
یک ساغرِ مَی دہد مرا بر لبِ کِشت
ہر چند بنزدِ خلق این باشد زشت
از سگ بترم اگر برم نامِ بہشت

(۶۸)

یہ فصلِ بہار اور یہ حسیں گوشۂ کِشت
یہ ساغرِ مے اور بتِ حور سرشت
موجود ہوں جب یہ سرو سامانِ طرب
کافر ہے جو بھولے سے بھی لے نامِ بہشت

دل سرِّ حیات را کماہی دانست
درموت ہم اسرارِ الٰہی دانست
امروز کہ باخودی ندانستی ہیچ
فردا کہ زخود روی چہ خواہی دانست

٦٩

جس کو بھی ملا عقدۂ ہستی کا پتہ
ہے موت بھی اِک رازِ خدا جان گیا
جب آج تو خود ہے تو نہ کچھ جان سکا
کل خود ہی نہ ہوگا تو کہاں جانے گا

در چشمِ محقّقان چہ زیبا و چہ زشت
منزلگہِ عاشقان چہ دوزخ چہ بہشت
پوشیدنِ بیدلان چہ اطلس چہ پلاس
زیرِ سرِ عاشقان چہ بالین وچہ خشت

۷۰

عاقل کے لیے ایک ہیں زیبا ہو کہ زشت
عشّاق کو یکساں ہیں جہنّم و بہشت
مستوں کے پہننے کو ہو اطلس کہ پلاس
مجنوں کے سرہانے کوئی تکیہ ہو کہ خشت

نیکی و بدی کہ در نہادِ بشر است

شادی و غمی کہ در قضا و قدر است

با چرخ مکن حوالہ کاندر رہِ عشق

چرخ از تو ہزار بار بیچارہ تر است

۱۰۷

ہے منبعِ نیکی و بدی طبعِ بشر

اور وجہِ غم و خوشی قضا اور قدر

تو ان کے لیے چرخ کو بدنام نہ کر

جو خود ہے ہزار بار بے چارہ تر

چون لالہ بہ نو روز قدح گیر بدست

با لالہ رخان اگر ترا فرصت ہست

می نوش مخور غصہ کہ این چرخِ کہن

ناگاہ ترا چو خاک گرداند پست

۷۲

نو روز ہے لالے کی طرح جام اُٹھا

جھرمٹ میں حسینوں کے حسیں جشن منا

خوش باش تو امروز کہ یہ چرخ کہن

ناگاہ تجھے خاک بنا ڈالے گا

سر دفترِ عالمِ معانی عشق است

سر بیتِ قصیدۂ جوانی عشق است

ای آن کہ خبر نداری از عالمِ عشق

این نکتہ بدان کہ زندگانی عشق است

۷۳

عنوانِ صحیفۂ معانی ہے عشق

تمہیدِ قصیدۂ جوانی ہے عشق

تو اس کی حقیقت سے خبردار نہیں

حق بات یہ ہے کہ زندگانی ہے عشق

دورانِ جہان بی مَی و ساقی، ہیچ است
بی زمزمہ و سازِ عراقی، ہیچ است
ہر چند در احوالِ جہان می نگرم
حاصل ہمہ عشرت است و باقی ہیچ است

۴۷

ہستیِٔ جہاں بے مَے و ساقی سب ہیچ
بے زمزمہ و سازِ عراقی سب ہیچ
اس دہر کے حالات پہ جتنا سوچیں
مقصد ہے فقط نشاط باقی سب ہیچ

دوری که درو آمدن و رفتنِ ماست

آن را نه بدایت نه نہایت پیداست

کس می نہ زند دمی درین معنی راست

کاین آمدن از کجا و رفتن بکجاست

۷۵

سربستہ معمّا ہے حیاتِ انساں

آغاز عیاں ہے نہ تو انجام عیاں

اب تک نہ کھلا راز کہ آخر انساں

آتا ہے کہاں سے اور جاتا ہے کہاں

زان بادہ کہ عمر را حیاتِ دگر است
پُر کُن قدحی گرچہ ترا دردِ سر است
بر نہ بکفم کہ کارِ عالم سمر است
بشتاب کہ عمرت ای پسر درگذر است

۷۶

وہ شے کہ ہے محبوبِ دل وجاں ساقی
انساں کو بناتی ہے جو انساں ساقی
لا جام میں بھر کر کہ حیاتِ فانی
ہے برق کی مانند گریزاں ساقی

ساقی رخت از ساغرِ جمشید بہ است
مُردن برہت زعمرِ جاوید بہ است
خاکِ قدمت کہ روزِ من روشن ازوست
ہر ذرّہ زصد ہزار خورشید بہ است

(۷۷)

یہ چشمِ حسیں ساغرِ جم ہو جیسے
ابرو کی کماں طاقِ حرم ہو جیسے
ساقی ترے گیسو سے مہکتی ہے بہار
قامت ترا گلزارِ ارم ہو جیسے

شادی مطلب کہ حاصل دہر غمی ست
ہر ذرّہ ز خاک کیقباد و جمیست
احوالِ جہان و عمرِ فانی و وجود
خوابی و خیالی و فریبی و دمیست

(۷۸)

جویائے طرب۔ حاصلِ ہستی غم ہے
ہر ذرّہ یہاں خاکِ قباد و جم ہے
دنیا ہو کہ ہستی ہو کہ فانی اِنساں
سب خواب و خیال اور فریب دم ہے

گردون کمری زعمرِ فرسودۂ ماست

جیحون اثری زچشمِ پالودۂ ماست

دوزخ شرری زرنجِ بیہودۂ ماست

فردوس دمی زوقتِ آسودۂ ماست

۷۹

گردوں ہے مِرے گردِ سفر کا حلقہ

قلزم ہے مِرے دیدۂ تر کا قطرہ

دوزخ ہے مِرے آتشِ غم کا شعلہ

جنّت ہے مِرے عیش و طرب کا لمحہ

گر گُل نبود نصیب ما خار بس است

ور نور بما نمی رسد نار بس است

گر خرقہ و خانقاہ و شیخی نبود

ناقوس و کلیسا و زنّار بس است

٨٠

گر گُل نہیں ملتا ہے ہمیں خار سہی

گر نور مقدّر میں نہیں نار سہی

گر خرقہ و خانقاہ اور شیخ نہیں

ناقوس و صنم کدہ و زنّار سہی

من ہیچ ندانم کہ مرا آنکہ سرشت

از اہلِ بہشت کرد یا دوزخِ زشت

جامی و بتی و بربطی بر لبِ کشت

این ہرسہ مرا نقد و ترا نسیہ بہشت

۸۱

یہ ابر یہ گل اور یہ سرشار فضا

ساقی و صراحی و رباب و نغمہ

میرے لیے اے دوست یہی جنّت ہے

ہاں تجھ کو مبارک ہو بہشتِ فردا

گُل گفت بہ از لقای من روئی نیست
چندین ستمِ گلابگر باری چیست
بلبل بزبانِ حال با او می گفت
یک روز کہ خندید کہ سالی نگریست

۸۲

گل نے جو کہا، کون حسیں ہے مجھ سا
پھر یہ ستمِ گلاب گر ہے کیسا
بلبل نے کہا، ہے یہی دستورِ چمن
اِک دن جو ہنسا ہے وہ برس بھر رویا

ہر ذرّہ کہ در روی زمینی بودست
خورشید رخی زہرہ جبینی بودست
گرد از رخِ نازنین بآزرم فشان
کان ہم رخ وزلفِ نازنینی بودست

(۸۳)

ہر ذرّہ کہ بر روئے زمیں ہے اے دوست
خورشید رخ و زہرہ جبیں ہے اے دوست
دامن کو بھی آہستہ جھٹک کہ یہ غبار
خاکِ لب و رخسارِ حسیں ہے اے دوست

ہشدار کہ روزگار شور انگیز است
ایمن منشین کہ تیغِ دوران تیز است
در کامِ تو گر زمانہ لوزینہ نہد
زنہار فرومبر کہ زہر آمیز است

٨٤

ہشیار زمانہ ہے بڑا شور انگیز
غفلت میں نہ رہ کہ تیغِ دوران ہے تیز
حلوہ بھی اگر منہ میں زمانہ رکھے
ہرگز نہ نگل اسے کہ ہے زہر آمیز

جائی کہ درو شرابِ گلرنگی نیست
یا لالہ رخی سرو قدی شنگی نیست
زانجا بگریز گر ہمہ خلد آنجاست
این است سخن در سخنت جنگی نیست

۸۵

گر بزم نہیں ساز نہیں چنگ نہیں
ساقیِ حسیں بادہ گلرنگ نہیں
فردوس بھی مل جائے تو منظور نہ کر
فردوس بھی اس بزم کے پاسنگ نہیں

فصلِ گل و طرفِ جوئبار و لبِ کشت
با یک دو سہ تازہ دلبری حور سرشت
پیش آر قدح کہ بادہ نوشانِ صبوح
آسودہ ز دوزخ اند و فارغ ز بہشت

(۸۶)

یہ گل، یہ لبِ جو، یہ حسیں سبزۂ کشت
یہ حلقۂ نازک بدناں حور سرشت
یہ جوشِ بہاراں، یہ سرورِ ہستی
ایسے میں کہاں فکرِ جہنّم و بہشت

می نوش کہ عمرِ جاودانی این است
خود خاصیتِ دورِ جوانی این است
ہنگامِ گل و مَی است و یاران سرمست
خوش باش دمی کہ زندگانی این است

٨٧

مَے نوش کہ عمرِ جاودانی ہے یہی
خود خاصیتِ دورِ جوانی ہے یہی
ہنگامِ گل و بادہ ہے احباب ہیں مست
خوش باش ابھی کہ زندگانی ہے یہی

در خواب بُدم مرا خردمندی گفت
کز خواب کسی را گل شادی نشگفت
کاری چه کنی که با اجل باشد جفت
مَی خور که بزیرِ خاک می باید خفت

۸۸

ساقی نے کہا یہ بھی کوئی سونا ہے
کیا عمر گراں مایہ یونہی کھونا ہے
اُٹھ ساغرِ مَے لے کہ اجل کے ہاتھوں
اِک روز تہِ خاک تجھے سونا ہے

دل گفت مرا علمِ لدنی ہوس است
تعلیم بکن اگر ترا دسترس است
گفتم کہ الف گفت دگر ہیچ مگو
در خانہ اگر کس است یکحرف بس است

٨٩

دل بولا کہ ہے علمِ لدنی کی ہوس
بے علمِ لدنی تو یہ سینہ ہے قفس
میں نے جو کہا الف تو بولا خاموش
ہے گھر میں اگر کوئی تو اِک حرف ہے بس

تا بتوانی غمِ جہان، ہیچ مسنج
بر دل منہ از آمدہ و نامدہ رنج
خوش می خور و می باش درین دیرِ سپنج
با خود نبری جوی اگر داری گنج

۹۰

دو روزہ جہاں میں غمِ فردا کیسا
ہر لمحۂ موجود کو سرشار بنا
اے بوالہوسِ مال و متاعِ دنیا
جائے گا تو اِک جو بھی نہ لے جائے گا

روزی ست خوش و ہوا نہ گرم است و نہ سرد

ابر از رخِ گلزار ہمی شوید گرد

بلبل بزبانِ حال نزدِ گُلِ زرد

فریاد ہمی کند کہ مَی باید خورد

۹۱

پر کیف ہے دن اور ہے سرشار فضا

برکھا نے حسیں پھولوں کا منہ چوم لیا

کہتی ہے یہی شاہدِ گل سے بلبل

ہے وقتِ طرب جام اُٹھا جام اُٹھا

یارانِ موافق ہمہ از دست شدند

در پای اجل یکان یکان پست شدند

خوردیم زیک شراب در مجلسِ عمر

دَوری دو سہ پیشتر زما ست شدند

۹۲

احباب بتدریج سبھی دور ہوئے

ظلماتِ عدم میں جا کے مستور ہوئے

اِک عمر رہے محفلِ ہستی میں شریک

کچھ دَور چلے ہی تھے کہ بس چُور ہوئے

مگذار کہ غصہ در کنارت گیرد

و اندوہِ محال روزگارت گیرد

مگذار کتاب ولبِ آب ولبِ کشت

زان پیش کہ خاک در حصارت گیرد

۹۳

خوش باش سدا، غم سے کنارا کر لے

ہر لمحے کے دامن میں تو خوشیاں بھر لے

ہاں ترک نہ کر سبزہ وساقی وکتاب

قبل اس سے کہ مٹی سے تری سبزہ اُگے

آنان کہ محیطِ فضل و آداب شدند
در جمعِ علوم شمعِ اصحاب شدند
رہ زین شبِ تاریک نبردند بروز
گفتند فسانہ ای و در خواب شدند

۹۴

جو اہلِ کمال و فضل و آداب ہوئے
علّامہ بنے مشعلِ ارباب ہوئے
پہنچے نہ شبِ تار سے دن تک یارو
افسانے گھڑے مستِ مئے خواب ہوئے

این قافلهٔ عمر عجب می گذرد
دریاب دمی که در طرب می گذرد
ساقی غمِ فردای حریفان چه خوری
پیش آر پیاله که شب می گذرد

یہ قافلۂ عمر عجب گذرے ہے
کب لمحہ کوئی مستِ طرب گذرے ہے
رہنے دے ابھی تذکرۂ غم ساقی
لا ساغرِ سرشار کہ شب گذرے ہے

امشب مئیِ جامِ یک منی خواہم کرد
خود را بدو رطلِ مَی غنی خواہم کرد
اوّل سہ طلاق عقل و دین خواہم گفت
پس دخترِ رز را بزنی خواہم کرد

۹۶

یوں آج کی شب پیاس دل وجاں کی بجھے
اے ساغرِ سرشار غنی کر دے مجھے
دینا ہے مجھے دین کو دانش کو طلاق
اے دخترِ رز عقد میں لانا ہے تجھے

آنکہ کہ نہالِ عمرِ من کندہ شود
و اجزام زیکدِ گر پراگندہ شود
گر زانکہ صراحیٔ کنند از گِلِ ما
حالی کہ پُر از مَیش کنی زندہ شود

۹۷

ہاں پیڑ کی مانند میں گر جاؤں گا
ہاں خاک شدہ اپنا بدن پاؤں گا
مٹی سے مری جام بنے گا جس دم
صہبا کی طرح جام میں لہراؤں گا

خورشید کمندِ صبح بربام افگند
کیخسروِ روز مہرہ در جام افگند
می خور کہ ندای عشق ہنگامِ سحر
آوازۂ "اِشرَبُوا" در ایام افگند

۹۸

پھوٹا شبِ تیرہ سے اُجالا ساقی
خورشید نے پیمانہ اُچھالا ساقی
ہے وقتِ سحر دورِ مئے و جام چلے
میخانے کا میخانہ اُٹھالا ساقی

قومی زگزاف در غرور افتادند
قومی ز پیِ حور و قصور افتادند
معلوم شود چو پردہ ہا بردارند
از کوی تو دُور دُور افتادند

۹۹

کچھ لوگ ہیں مستِ مئے پندار و غرور
کچھ لوگ ہیں دل باختۂ حور و قصور
جب پردہ اُٹھے گا تو یہ ہوگا معلوم
یہ لوگ ترے کوچے سے ہیں کوسوں دور

این کاسه که بس نکوش پرداخته اند
بشکسته و در رہگذر انداختہ اند
زنہار بروقدم بخواری نہ نہی
کان کاسہ ز کاسہای سر ساختہ اند

۱۰۰

ٹوٹا ہوا کاسہ کہ ہے رستے میں پڑا
تحقیر سے ہرگز اسے ٹھوکر نہ لگا
غافل ہے تو شاید تجھے معلوم نہیں
یہ کاسہ کئی کاسۂ سر سے ہے بنا

در راه چنان رَو کہ سلامت نہ کنند
با خلق چنان زی کہ قیامت نہ کنند
در مسجد اگر روی چنان رَو کہ ترا
در پیش نخواہند و امامت نہ کنند

۱۰۱

یوں چل کہ نہ رستے میں کریں لوگ سلام
یوں جی کہ اُٹھائیں نہ کوئی حشر عوام
مسجد میں اگر جائے تو اہلِ مسجد
تعظیم کریں اور بنائیں نہ امام

ز آوردنِ من نبوُد گردون را سود
وز بردنِ من جاہ و جلالش نفزود
وز ہیچ کسی نیز دو گوشم نشنید
کاوردن و بردنِ من از بہرچہ بود

(۱۰۲)

لانے سے مِرے چرخ کی عزّت نہ بڑھی
لے جانے سے عظمت میں بھی آئی نہ کمی
افسوس مگر مجھ پہ یہ عقدہ نہ کھلا
اِس زحمتِ بیجا کی ضرورت کیا تھی

در دہر کسی بہ گلعذاری نرسید
تا بر دلش از زمانہ خاری نرسید
در شانہ نگر تا بصد شاخ نشد
دستش بسرِ زلفِ نگاری نرسید

۱۰۳

جب تک نہ ہو دِل خارِ زمانہ سے فگار
ممکن نہیں ہاتھ آئے کوئی لالہ عذار
صد چاک نہ ہو سینۂ شانہ جب تک
ممکن نہیں مشاطگیِ زلفِ نگار

خواہی کہ ترا رتبتِ ابرار رسد
مپسند کہ کس راز تو آزار رسد
از مرگ میندیش و غمِ رزق مخور
کین ہر دو بوقتِ خویش ناچار رسد

۱۰۴

وہ رتبہ ابرار کہاں پاتے ہیں
مخلوقِ خدا پر جو ستم ڈھاتے ہیں
زنہار غمِ رزق و غمِ مرگ نہ کر
یہ دونوں تو ہر حال میں آجاتے ہیں

گردون ز زمین ہیچ گلی برنارد

کش نشکند و باز بگل نسپارد

گر ابر چو آب خاک را بر دارد

تا حشر ہمہ خونِ عزیزان بارد

(۱۰۵)

اس چرخِ ستمگار نے کتنے غنچے

کھلنے بھی نہ پائے تھے کہ برباد کیے

پانی کے عوض خاک سے گر ابر اُٹھے

تا حشر سدا خونِ عزیزاں برسے

یاران چو باتفاق میعاد کنند

خودرا بجمالِ یکدگر شاد کنند

ساقی چو مئی مغانہ درکف گیرد

بیچارہ فلان را بہ دعا یاد کنند

۱۰۶

احباب جو بزمِ طرب آباد کریں

آپس میں ملیں قلب و جگر شاد کریں

اور ساغرِ رنگیں جو اُٹھائے ساقی

اس بندۂ مہجور کو بھی یاد کریں

افسوس کہ سرمایہ زکف بیرون شد
وز دستِ اجل بسی جگرہا خون شد
کس نامد ازان جہان کہ پرسم ازوی
کاحوالِ مسافرانِ عالم چون شد

(۱۰۷)

افسوس کہ اب وقتِ سفر آپہنچا
قزاقِ اجل نے نہ کسی کو چھوڑا
لوٹا نہ کوئی ورنہ یہ پوچھا ہوتا
دنیا کے مسافروں کا کیا حال ہوا

در دہر ہر آنکہ نیم نانی دارد

وز بہرِ نشست آستانی دارد

نی خادمِ کس بود نہ مخدوم کسی

گو شاد بزی کہ خوش جہانی دارد

١٠٨

دُنیا میں جسے نانِ جویں حاصل ہے

رہنے کو بھی تھوڑی سی زمیں حاصل ہے

خادم ہے کسی کا نہ کسی کا مخدوم

اس کو یہیں فردوسِ بریں حاصل ہے

گویند کہ مرد را ہنر می باید
یا نسبتِ عالیِ پدر می باید
این دور چنان شدست در نوبتِ ما
کین ہا ہمہ ہیچ است زر می باید

(۱۰۹)

کہتے ہیں کہ ہوتی ہے ہنر کی عزّت
عالی نسب و والا گہر کی عزّت
بدلا ہے کچھ اسطرح زمانے کا مزاج
امروز فقط ہوتی ہے زر کی عزّت

این چرخِ جفا پیشه دغائی بنیاد
ہرگز گرہِ بستۂ کس را نکشاد
آن جا کہ یکی دید کہ داغی دارد
داغِ دگری بر سرِ آن داغ نہاد

۱۱۰

رنج و غم و آلام بڑھا دیتا ہے
سفّاک فلک سب کو دغا دیتا ہے
ظالم کو نظر آتا ہے جب داغ کہیں
اِک اور بھی داغ اس پہ لگا دیتا ہے

کس را پسِ پردۂ قضا راہ نشد
وز سرّ خدا ہیچ کس آگاہ نشد
ہر شخص ز سرِ قیاس چیزی گفتند
معلوم نہ گشت و قصّہ کوتاہ نشد

۱۱۱

اسرار الٰہی کا چلا کچھ نہ پتا
اور رازِ قضا سے کوئی واقف نہ ہوا
گھڑتے رہے سب لوگ خیالی باتیں
پردہ ہی ہٹا اور نہ معمّا ہی کھلا

آن را مشمر که ذو فنون آید مرد
در عہد و وفا نگر کہ چون آید مرد
از عہدۂ عہد اگر برون آید مرد
از ہر چہ گمان بری فزون آید مرد

(۱۱۲)

ہو لاکھ کوئی علم و ہنر میں یکتا
یہ دیکھ کہ ہے عہد و وفا میں کیسا
جو قول کا سچّا ہے وفا میں پورا
مسجودِ زمانہ ہے وہی مردِ خدا

آن روز کہ توسنِ فلک زین کردند
و آرائشِ مشتری و پروین کردند
این بود نصیبِ ما ز دیوانِ قضا
مارا چہ گنہ قسمتِ ما این کردند

(۱۱۳)

جس روز کہ افلاک کی تخلیق ہوئی
مہر و مہ و انجم کی حسیں بزم سجی
تر دامنی اس دِن مِری تقدیر بنی
اب کون کہے اس میں خطا ہے کس کی

آن کاسہ گری کہ کاسۂ سرہا کرد
در کاسہ گری صنعتِ خود پیدا کرد
بر خوانِ وجودِ ما نگون کاسہ نہاد
وان کاسۂ سرنگون پُر از سودا کرد

۱۱۴

صانع نے بنائے جو سروں کے کاسے
اور اپنے کمالاتِ ہنر دکھلائے
پھر تن پہ ہمارے انھیں اوندھا رکھا
اور بھر دئے ہر کاسے میں لاکھوں سودے

این کوزه گران که دست در گِل دارند
عقل و خرد و ہوش برو بگمارند
بر گِل لگد و طمانچہ تا چند زنند
خاکِ بدن است تا چہ می پندارند

115

اے کوزہ گرو کوزہ گرو کوزہ گرو
اے بے خبرو بے خبرو بے خبرو
روندو نہ گِل کوزہ کہ ہے خاکِ بشر
اے بے بصرو بے بصرو بے بصرو

آنہا کہ خلاصۂ جہان ایشان اند

بر اوجِ فلک براقِ فکرت رانند

در معرفتِ ذاتِ تو مانندِ فلک

سرگشتہ و سرنگون و سرگردانند

۱۱۶

جو حکمت و دانش میں ہیں مشہورِ زماں

ہے گردِ سفر جن کے لیے کاہکشاں

وہ معرفتِ ذات میں مانندِ فلک

حیراں ہیں شب و روز سدا سرگرداں

افسوس کہ نامۂ جوانی طے شد

وین تازہ بہارِ ارغوانی طے شد

آن مرغِ طرب کہ نامِ او بود شباب

فریاد ندانم کہ کی آمد کی شد

(۱۱۷)

افسوس کہ پل بھر میں جوانی گزری

آتے ہی بہارِ ارغوانی گزری

بجلی کی طرح آیا بھی گزرا بھی شباب

گزرا جو شباب زندگانی گزری

ای بس کہ نباشیم و جہان خواہد بود
نی نام زما، نہ نشان خواہد بود
زین پیش نبودیم و نبُد ہیچ خلل
زین پس چو نباشیم، ہمان خواہد بود

۱۱۸

جب ہم نہیں ہوں گے پھر بھی ہو گا یہ جہاں
باقی نہ تو نام اپنا رہے گا نہ نشاں
دنیا میں نہ تھے ہم تو نہ تھا کوئی خلل
گر ہم نہیں ہوں گے تو بھی ہو گا نہ زیاں

تا چند اسیرِ رنگ و بو خواہی شد
و اندر پیِ ہر زشت و نکو خواہی شد
گر چشمۂ زمزمی و گر آبِ حیات
آخر بدلِ خاک فرو خواہی شد

(۱۱۹)

کب تک یہ فریبِ رنگ و بو کھائے گا
دُنیا کی اداؤں میں دل اُلجھائے گا
تو چشمۂ زمزم ہو کہ ہو آبِ حیات
اِک روز تہِ خاک چلا جائے گا

جانم بفدای آن که او اہل بود
سر در قدمش اگر نہم سہل بود
خواہی کہ بدانی بہ یقین دوزخ را
دوزخ بہ جہان صحبتِ نا اہل بود

۱۲۰

جو اہل ہے ہے نازشِ عالم ساقی
نا اہل ہے شائستۂ ماتم ساقی
ہے اہل کی صحبت میں سرورِ جنّت
نا اہل کی صحبت ہے جہنّم ساقی

عمرت تا کی بخود پرستی گزرد
یا در پیٔ نیستی و ہستی گزرد
می نوش کہ عمری کہ اجل در پیٔ اوست
آن بہ کہ بخواب یا بمستی گزرد

۱۲۱

تا چند حیات خود پرستی میں کٹے
دنیا کی ہوس روح کی پستی میں کٹے
مے نوش کہ جس عمر کے درپے ہو اجل
بہتر ہے کہ وہ عالمِ مستی میں کٹے

ہر چند دلم ز عشق محروم نشد

کم ماند ز اسرار کہ مفہوم نشد

واکنون کہ بچشم عقل می نگرم

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد

۱۴۲

کب عشق سے دل اپنا رہا ہے محروم

اسرار نے بھی وا کیے بابِ مفہوم

اب چشمِ حقیقت سے جو دیکھا ہم نے

معلوم ہوا یہ کہ نہیں کچھ معلوم

ہر صبح کہ روی لالہ شبنم گیرد
بالای بنفشہ در چمن خم گیرد
انصاف مرا ز غنچہ خوش می آید
کو دامنِ خویشتن فراہم گیرد

(۱۲۳)

شبنم سے بھرے لالہ و گل نے کاسے
جھولی میں بنفشہ نے بھی موتی رولے
کس درجہ ہیں خوددار چمن کے غنچے
بیٹھے ہیں سمیٹے ہوئے دامن اپنے

یک قطرۂ آب بود با دریا شد
یک ذرّۂ خاک بازمیں یکتا شد
آمد شدنِ تو اندریں عالم چیست
آمد مگسی پدید و ناپیدا شد

(۱۲۴)

پانی کا جو قطرہ تھا سمندر ہے بنا
جو خاک کا ذرّہ تھا بنا ہے صحرا
ایسا ہے جہاں میں ترا آنا جانا
جیسے شبِ تاریک میں ٹوٹے تارا

ای ذاتِ تو سر دفترِ اسرارِ وجود
نقشِ صفتت بر در و دیوارِ وجود
در پردۂ کبریا نہان گشتہ ز خلق
بنشستہ عیاں بر سرِ بازارِ وجود

۱۲۵

اے تو کہ ہے سر دفترِ اسرارِ وجود
ہے تیری صفت مظہرِ آثارِ وجود
گرچہ ہے نقابِ کبریائی میں نہاں
پھر بھی ہے عیاں تو سرِ بازارِ وجود

از واقعۂ ترا خبر خواہم کرد
وآں را بدو حرف مختصر خواہم کرد
با عشقِ تو در خاک فرو خواہم شد
با مہرِ تو سر ز خاک بر خواہم کرد

۱۳۶

اے دوست ترا عشق ہے مقصودِ حیات
ہے کعبۂ جاں میرے لیے تیری ذات
جاؤں گا تہِ خاک ترا درد لیے
اُٹھوں گا سرِ حشر تری یاد کے ساتھ

زان پیش که غمہات شبیخون آرند

فرمای که تا بادۂ گلگون آرند

تو زر نۂ ای غافلِ نادان که ترا

در خاک نہند و باز بیرون آرند

۱۲۷

قبل اس سے کہ آلام قیامت ڈھائیں

آ عیش و مسرّت کے ترانے گائیں

تو زر نہیں اے غافلِ ناداں کہ تجھے

دفنائیں بھی اور خاک سے باہر لائیں

دارم گنہی کہ پشتِ ایمان شکند

بازارِ تمامِ بت پرستان شکند

بارِ گنہم اگر بمیزان سنجند

ترسم کہ بروز حشر میزان شکند

۱۲۸

اتنے ہیں گنہ کہ پشتِ ایماں ٹوٹے

پندارِ صنم نخوتِ شیطاں ٹوٹے

تولیں جو سرِ حشر یہ انبارِ گناہ

ڈر ہے نہ کہیں بوجھ سے میزاں ٹوٹے

تاجِ دول و شہی بنامت کردند
عرش و فلک و کعبہ مقامت کردند
اکنون کہ بہ رہبری امامت کردند
سرتاسرِ آفاق غلامت کردند

(۱۲۹)

منسوب ہوئے تاج و دول تیرے نام
عرش و فلک و کعبہ بنے تیرے مقام
بخشی گئی دنیا کی امامت تجھ کو
سرتاسرِ آفاق ہوئے تیرے غلام

گویند کسانی کہ زمی پرہیز ند
زان سان کہ بمیر ند بدان سان خیز ند
ما با مَی و معشوق ازانیم مقیم
باشد کہ بحشر مان چنان انگیز ند

رندانِ بلانوش سے یہ شیخ کہیں
لوگ اٹھیں گے اس حال میں جس حال مریں
ہم بھی ہیں سدا بادہ و معشوق کے ساتھ
تا ساتھ جئیں ساتھ مریں ساتھ اُٹھیں

مَی خور کہ ز دل کثرت و قلّت ببرد
واندیشۂ ہفتاد و دو ملّت ببرد
پرہیز مکن ز کیمیائی کہ ازو
یک جرعہ خوری ہزار علّت ببرد

(۱۳۱)

ہاں دغدغۂ کثرت و قلّت نہ رہے
اندیشۂ ہفتاد و دو ملّت نہ رہے
اکسیر ہے سَو درد کا درماں ہے شراب
اِک جرعہ جو پی لے کوئی علّت نہ رہے

ہر جرعہ کہ ساقیش بخاک اندازد
در سینۂ خاک آتشِ غم بنشاند
سبحان اللہ تو بادہ می پنداری
آبی کہ زصد درد دلت برہاند

(۱۳۲)

جب جرعۂ مے ساقی گرا دیتا ہے
دھرتی کی دبی آگ بجھا دیتا ہے
تو زہر سمجھتا ہے جسے اے ناداں
سَو دردو الم دل کے مِٹا دیتا ہے

گویند بحشر گفتگو خواہد بود

وان یارِ عزیز تند خو خواہد بود

از خیر نکو بجز نکوئی ناید

خوش باش کہ عاقبت نکو خواہد بود

۱۳۳

ہاں پیشِ خدا حشر میں جانا ہوگا

اور فردِ عمل کا بھی تقاضا ہوگا

قہاری کے پردے میں ہے دریائے کرم

خوش باش کہ انجام بھی اچھا ہوگا

با آن که شراب پردهٔ ما بدرید

بهتر ز میِ ناب کسی ہیچ ندید

من در عجبم ز می فروشان کا یشان

بہ زانکہ فروشند چہ خواہند خرید

۱۳۴

ہم جام نہ دیں کشورِ جم کے بدلے

میخانہ نہ دیں باغِ ارم کے بدلے

ان بادہ فروشوں کو کہیں کیا یارو

جو کیمیا بیچے ہیں درم کے بدلے

وقتی ست کہ از سبزہ جہان آرایند
موسیٰ صفتان زِ شاخ کف بنمایند
عیسیٰ نفسان ز خاک بیرون آیند
در چشمِ سحاب دیدہ ہا بکشایند

۱۳۵

ہے وقت کہ دھرتی پہ ہری دوب بچھائیں
ہر پیڑ پہ شاخیں یدِ بیضا چمکائیں
عیسیٰ نفساں خاک سے باہر آئیں
اور ابرِ کرم چادرِ مریم لہرائیں

از رفتهٔ قلم ہیچ دگر گون نشود

وز خوردنِ غم بجز جگر خون نشود

گر در ہمہ عمرِ خویش خونابہ خوری

یک قطرہ از آنکہ ہست افزون نشود

۱۳۶

جو ہونا ہے جو کچھ بھی ہوا ہے اے دوست

وہ لوحِ مقدّر پہ لکھا ہے اے دوست

اب لاکھ جتن جرأتِ تدبیر کرے

تقدیر کا لکھا بھی مٹا ہے اے دوست

دی کوزہ گری بدیدم اندر بازار

بر پارہ گلی لگد ہمی زد بسیار

وان گل بزبانِ حال با اُو می گفت

من ہمچو تو بودہ ام مرا نیکو دار

۱۳۷

بازار میں کل کوزہ گرِ بے پروا

اِک تودۂ گل پیروں تلے روندتا تھا

تودے نے کہا میں بھی کبھی تجھ سا تھا

آہستہ مرے بھائی ذرا آہستہ

عمرِ تو چہ دو صد و چہ سہ صد چہ ہزار
زین کہنہ سرا بروں برندت ناچار
گر بادشہی و گر گدای بازار
این ہر دو بیک نرخ بوَد آخر کار

(۱۳۸)

ہوں سال تری عمر کے دو سو کہ ہزار
جانا ہی پڑے گا تجھے اک دن ناچار
شاہانِ جہاں ہوں کہ گدائے بازار
بک جاتے ہیں اِک نرخ میں سب آخر کار

در دائرۂ سپہرِ ناپیدا غور
مَی نوش بخوشدلی کہ دَوراست بجور
نوبت چو بدَورِ تو رسد آہ مکن
جامی ست کہ جملہ راچشانند بزور

(۱۳۹)

طوفانوں کی زد میں بھی سفینہ ہوگا
اِس دہر میں ہر حال میں جینا ہوگا
جب وقت پلائے گا تجھے جامِ اجل
یہ زہر بھی ہنستے ہوئے پینا ہوگا

وقتِ سحر است خیز ای طرفہ پسر

پُر بادہ لعل کن بلورین ساغر

کین یکدمِ عاریت درین کنجِ فنا

بسیار بجوئی و نیابی دیگر

۱۴۰

یہ وقتِ سحر پھر سے نہیں آئے گا

دے جام کہ پل بھر میں گزر جائے گا

یہ لمحہ جو گزرا مرے ساقی اِک بار

ڈھونڈے گا اسے لاکھ نہیں پائے گا

افلاک کہ جز غم نفزایند دگر
ننہند بجا تا نربایند دگر
نا آمدگان اگر بدانند کہ ما
از دہر چہ می کشیم نایند دگر

۱۴۱

افلاک رہِ راست پہ آئیں نہ کبھی
ممکن ہی نہیں ظلم یہ ڈھائیں نہ کبھی
آئے جو نہیں یہاں اگر سُن پائیں
جو ہم پہ گزرتی ہے تو آئیں نہ کبھی

ای دوست غمِ جہانِ بیہودہ مخور

بیہودہ غمِ جہانِ فرسودہ مخور

چون "بود" گذشت و نیست "نابود" پدید

خوش باش و غمِ بودہ و نابودہ مخور

۱۴۳

اے دوست غمِ جہانِ بے ہودہ نہ کھا

بے ہودہ غمِ جہانِ فرسودہ نہ کھا

ماضی جو تھا گزرا نہیں فردا معلوم

خوش باش غمِ "بودہ و نابودہ" نہ کھا

با یار چو آرمیدہ باشی ہمہ عمر
لذّاتِ جہان چشیدہ باشی ہمہ عمر
ہم آخرِ عمر رحلتے باید کرد
خوابی باشد کہ دیدہ باشی ہمہ عمر

(۱۴۴)

ہستی کو تعیّش میں ڈبویا ہم نے
ہر لمحے کو سرشار بنایا ہم نے
جب آنکھ ہوئی بند تو عقدہ یہ کھُلا
اِک خواب تھا تا عمر جو دیکھا ہم نے

ای چرخِ فلک نہ عقل داری نہ ہنر
ہرگز نہ کنی بکارِ آزادہ نظر
نامردان راہمی دہی گنج و گہر
احسنت زہی چرخ مخنّث پرور

(۱۴۴)

اے چرخ نہیں تجھ میں کوئی عقل و ہنر
مردانِ فضیلت کی نہیں تجھ کو خبر
نااہلوں کو دیتا ہے سدا گنج و گہر
قرباں ترے چرخِ مخنّث پرور

ای دل ہمہ اسباب جہان خواستہ گیر
باغِ طربت بہ سبزہ آراستہ گیر
وانگاہ برآن سبزہ شبی چون شبنم
بنشستہ و بامداد برخاستہ گیر

(۱۴۵)

اے دل تجھے حاصل ہے متاعِ دنیا
بزم طرب و عیش گلستاں میں سجا
رہ غرقِ طرب رات بھر اور وقتِ سحر
شبنم کی طرح صحنِ چمن سے اُڑ جا

از روی حقیقت و نہ از روی مجاز
مالعبتگانیم و فلک لعبت باز
بازیچہ ہمی کنیم بر نطعِ وجود
رفتیم بہ صندوقِ عدم یک یک باز

(۱۴۶)

کٹھ پتلیاں انساں ہیں فلک بازیگر
جو ان کو نچاتا ہے سدا شام و سحر
اور ختم تماشا یہ بڑی شان کے ساتھ
رکھ دیتا ہے صندوقِ عدم میں بھر کر

بازی بودم پریدہ از عالم راز
بوتا کہ پرم دمی نشیبی بفراز
این جا چو نیافتم کسی محرم راز
زان در کہ درآمدم برون رفتم باز

۱۴۷

میں بازِ حسیں عالمِ اسرار کا تھا
ہر دشت و جبل شہر و بیاباں میں پھرا
لیکن نظر آیا نہ کہیں محرمِ راز
آیا تھا جہاں سے میں وہیں لوٹ چلا

یارب تو جمالِ آن مہ انگیز

آراستۂ بہ سنبلِ عنبر بیز

پس حکم ہمی کنی کہ دروی منگر

این حکم چنان بود کہ کج دار و مریز

۱۴۸

اس فتنۂ دوراں کی تو تخلیق کرے

اور اس میں قیامت کی ادائیں بھر دے

پھر اس پہ یہ فرمان کہ دیکھیں نہ اسے

ممکن بھی ہے ساغر تو جھکے مے نہ گرے

لب بر لبِ کوزہ بردم از غایتِ آز

تا زو طلبم واسطۂ عمرِ دراز

لب بر لبِ من نہاد و می گفت براز

می خور کہ بدین جہان نمی آئی باز

۱۴۹

میں نے لبِ کوزہ پہ لب اپنے رکھے

تا اس کی وساطت سے مری عمر بڑھے

ہونٹوں کو مرے چوم کے کوزے نے کہا

میں بھی کبھی تجھ سا تھا ذرا یاد رہے

وقتِ سحراست خیزای مایۂ ناز

نرمک نرمک بادہ خورد چنگ نواز

کانہا کہ بجایند نپایند دراز

وانہا کہ شدند کس نمی آید باز

(۱۵۰)

ہے وقتِ سحر جاگ مری زہرہ جبیں

لا ساغرِ مے چھیڑ ربابِ رنگیں

یہ عمر دوبارہ نہیں بخشی جاتی

جو یاں سے گیا لوٹ کے آیا ہے کہیں

از جملہ رفتگانِ این راہِ دراز
باز آمدہ کو کہ بما گوید راز
ہاں بر سرِ این دوراہِ آز و نیاز
چیزی نگذاری کہ نمی آئی باز

۱۵۱

اسرارِ عدم کوئی بھی بتلا نہ سکا
اور موت کی گتھی کوئی سلجھا نہ سکا
ہستی کے دوراہے پہ کوئی شے مت چھوڑ
جو یاں سے گیا لوٹ کے پھر آ نہ سکا

این چرخ که با کسی نمی گوید راز
کُشتہ بستم ہزار محمود و ایاز
می خور کہ نہ بخشد بہ کسی عمرِ دراز
وانکس کہ شد از جہان نمی آید باز

۱۵۲

یہ چرخِ ستم پیشہ کہ ہے گنبدِ راز
قتل اس نے کیے سیکڑوں محمود و ایاز
خوش باش کہ جا کر نہیں آتا کوئی
مے پی کہ نہیں عمر کوئی عمر دراز

با مردمِ پاکِ عقل و عاقل آمیز

وز نا اہلان ہزار فرسنگ گریز

گر زہر دہد ترا خردمند بنوش

ور نوش رسد ز دستِ نا اہل بریز

۱۵۳

جنّت سے بھی ہے صحبتِ دانا خوشتر

دوزخ سے بھی ہے قربتِ ناداں بدتر

دانا سے ملے زہر خوشی سے پی لے

نادان دے امرت بھی تو منظور نہ کر

سرمست بہ میخانہ گذر کردم دوش

پیری دیدم مست و سبوئی بردوش

گفتم ز خدا شرم نداری ای پیر

گفتا کرم از خداست مَی نوش خموش

(۱۵۴)

گزرا جو خرابات سے میں کل مدہوش

اِک پیر نظر آئے صراحی بردوش

میں نے جو کہا قبلہ کوئی خوفِ خُدا

فرمایا کہ اے منکرِ رحمت خاموش

در کارگہِ کوزہ گران بودم دوش
دیدم دو ہزار کوزہ گویا و خموش
ناگاہ یکی کوزہ برآورد خروش
کو کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش

(۱۵۵)

کوزے کی دکاں پر تھا جو لوگوں کا خروش
اِک کوزہ پکارا: یہ ہیں بیگانۂ ہوش
کل سب اسی انبار میں شامل ہونگے
یہ کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش

خیّام اگر ز بادہ مستی خوش باش
گر با صنمی دمی نشستی خوش باش
چون عاقبتِ کارِ جہان نیستی ہست
پندار کہ نیستی چو ہستی خوش باش

(۱۵۶)

حاصل ہے اگر رندی و مستی خوش باش
دو روزہ ہے یہ عیش پرستی خوش باش
خیّام جب انجامِ جہاں نیستی ہے
جب تک ہے جہاں میں تری ہستی خوش باش

غم چند خوری بکارِ نا آمدہ پیش
رنج است نصیبِ مردمِ دور اندیش
خوش باش و جہان تنگ مکن بر دلِ خویش
کز خوردنِ غم قضا نگردد کم و بیش

(۱۵۷)

فردا کہ نہیں جس کا تجھے کوئی یقیں
اے دوست نہ ہو اس کے لیے آج حزیں
خوش باش سدا شکوۂ ایام نہ کر
رونے سے کبھی تقدیر بدلتی ہے کہیں

کو دل کہ بداند نفسی اسرارش
کو گوش کہ بشنود دمی گفتارش
معشوقہ جمال می نماید شب و روز
کو دیدہ کہ تا برخورد از دیدارش

(۱۵۸)

وہ دل ہے کہاں جو ترے اسرار پڑھے
وہ گوش کہاں جو تری گفتار سُنے
ہر سمت ہے عالم میں تری جلوہ گری
وہ چشم کہاں جو ترا دیدار کرے

جامی ست کہ عقل آفرین می زندش
صد بوسہ زمہر بر جبین می زندش
این کوزہ گرِ دہر چنین جامِ لطیف
می سازد و باز بر زمین می زندش

۱۵۹

اِک جام وہ ہے عقل جسے پیار کرے
اور ثبت کرے اس کی جبیں پر بوسے
کیا جانیے کیوں کوزہ گرِ دہر یہ جام
خود ناز سے ڈھالے اسے خود ہی توڑے

از جرمِ گلِ سیاہ تا اوجِ زحل
کردم ہمہ مشکلاتِ گیتی را حل
بکشادم بندہای مشکل بحیل
ہر بند کشادہ شد بجز بندِ اجل

١٦٠

اس خاک سے تا عالمِ مریخ و زحل
ہر مشکلِ ہستی کو کیا ہم نے حل
عقدے تو کئی عقلِ رسا نے کھولے
سربستہ مگر آج بھی ہے رازِ اجل

باسروقدی تازه تر از خرمنِ گُل
از دست مده جامِ می و دامنِ گُل
زان پیش که ناگه شود از بادِ اجل
پیراہنِ عمرِ تو چو پیراہنِ گُل

(۱۶۱)

یہ ابر یہ ساقی صفتِ خرمنِ گُل
ہاں ترک نہ کر ساغرِ مَے دامنِ گُل
ناگاہ نہ ہو جائے اجل کے ہاتھوں
پیراہنِ ہستی ترا پیراہنِ گُل

من ظاہرِ ہر نیستی و ہستی دانم

من باطنِ ہر فراز و پستی دانم

با این ہمہ از دانشِ خود شرمم باد

گر مرتبہ ای ورای مستی دانم

(۱۶۲)

تھا زعم کہ ہیں فراز و پستی معلوم

اسرارِ فنا، رموزِ ہستی معلوم

ظاہر جو ہوئیں طفلکِ دانش کی حدیں

تب سے نہیں کچھ ورائے مستی معلوم

یکچند بکودکی بہ استاد شدیم
یکچند ز استادیِ خود شاد شدیم
پایانِ سخن شنو کہ مارا چہ رسید
از خاک در آمدیم و برباد شدیم

(۱۶۳)

مکتب میں گئے نازشِ استاد ہوئے
علّامہ بنے مانی و بہزاد ہوئے
افسوس یہی زیست کا حاصل نکلا
بس خاک سے اٹھّے تھے کہ برباد ہوئے

اے دوست بیا تا غمِ فردا نخوریم
وین یکدمِ عمر را غنیمت شمریم
فردا کہ ازین دہرِ کہن درگذریم
با ہفت ہزار سالگان ہمسفریم

۱۶۴

آ اے مرے ہمدم غمِ فردا نہ کریں
ہر لمحۂ ہستی کو غنیمت سمجھیں
فردا جو ہم اس دہرِ کہن سے گزریں
قرنوں کے مسافر ہمیں رستے میں ملیں

من گوہرِ خود بقیمتِ کم ندہم
دردِ تو بصد ہزار مرہم ندہم
خاکِ درِ تو بملکتِ جم ندہم
یک موی ترا بہر دو عالم ندہم

(۱۶۵)

کیوں کر ہو کوئی تسے بھی ترے غم سے عزیز
ہے درد ترا ہزار مرہم سے عزیز
کوچہ ہے ترا مملکتِ جم سے عزیز
واللہ ترا در ہے دو عالم سے عزیز

این چرخِ فلک کہ ما درو حیرانیم
فانوسِ خیال ازو مثالی دانیم
خورشید چراغِ آن و عالم فانوس
ما چو صوریم کاندرو گردانیم

۱٦٦

یہ چرخِ فلک اور یہ زمینِ انساں
فانوسِ خیالی ہے سراسر یہ جہاں
سورج ہے چراغ اور یہ عالم فانوس
ہم اس میں ہیں پرچھائیں کی صورت رقصاں

ما خرقهٔ زہد در سرِ خُم کردیم
در خاکِ خرابات تیمُّم کردیم
باشد کہ درونِ میکدہ دریابیم
عمری کہ درونِ مدرسہ گُم کردیم

۱۶۷

عمامہ کیا نذرِ مئے خم ہم نے
اور خم پہ کیا بڑھ کے تیمّم ہم نے
ممکن ہے خرابات میں مل جائے ہمیں
جس عمر کو مکتب میں کیا گُم ہم نے

گُل گفت کہ من یوسفِ مصرِ چمنم
یاقوتِ گرانمایہ و پُرُ زر دہنم
گفتم چو تو یوسفی نشانی بنمای
گفتا کہ بخون غرق نگر پیرہنم

(۱٦٨)

گُل بولا کہ ہوں یوسفِ مصرِ گلشن
دامن میں مِرے لعل ہیں پُرُ زر ہے دہن
میں نے جو کہا کوئی دلیلِ دعویٰ
وہ بولا کہ خونیں ہے مِرا پیراہن

مقصود ز جملہ آفرینش مائیم

در چشمِ خرد جوہرِ بینش مائیم

این دائرۂ جہان چون انگشتری است

بی ہیچ شکی نقشِ نگینش مائیم

(۱٦۹)

مقصودِ جہانِ آفرینش ہم ہیں

جانِ خرد و جوھرِ بینش ہم ہیں

یہ حلقۂ عالم ہے انگوٹھی کی طرح

اور اس کے نگینے کی نگارش ہم ہیں

در پای اجل چو من سرافگنده شوم
وز بیخ اُمید عمر برکنده شوم
زنہار گِلم بجز صراحی نکنید
باشد کہ ز بادہ تر شود زندہ شوم

١٧٠

جب بھی تنِ خاکی مرا بیجاں ہو جائے
اور خاک کی صورت میں نمایاں ہو جائے
اس خاک سے پھر صرف صراحی ڈھالیں
تا مئے سے جو تر ہو تو پھر انساں ہو جائے

تا چند اسیرِ عقلِ ہر روزہ شویم
در دہر چہ صد سالہ چہ یکروزہ شویم
در دہ قدحِ بادہ ازان پیش کہ ما
در کارگہِ کوزہ گران کوزہ شویم

۱۷۱

تا چند یونہی عقل کے احکام سُنیں
یکساں ہے جو اک روز کہ سو سال جئیں
دے جام مبادا کہ اجل آجائے
اور کارگہِ کوزہ میں ہم کوزہ بنیں

ای چرخ ز گردشِ تو خورسند نیم
آزادم کن کہ لائقِ بند نیم
گر میلِ تو با بیخرد و نا اہل است
من نیز چنان اہل و خردمند نیم

۱۷۲

گردش سے تری چرخ میں خرسند نہیں
ہاں چھوڑ مجھے کہ لائقِ بند نہیں
مائل بہ کرم ہے جو تو نادانوں پر
میں بھی تو کوئی اِتنا خردمند نہیں

معشوقہ عیان بود نمی دانستم
با ما بہ میان بود نمی دانستم
گفتم بطلب مگر بجائی برسم
چون تفرقہ آن بود نمی دانستم

۱۷۳

معشوق عیاں تھا ہمیں معلوم نہ تھا
ہم سب میں نہاں تھا ہمیں معلوم نہ تھا
یہ سوچ کے نکلے تھے کہ پائیں گے اُسے
وہ ساتھ رواں تھا ہمیں معلوم نہ تھا

گل گفت کہ دستِ زرفشاں آوردم

خنداں خنداں رو بجہاں آوردم

بند از سرِ کیسہ برگرفتم رفتم

ہر نقد کہ بود درمیاں آوردم

۱۷۴

پھولوں نے کہا کیسۂ زر ساتھ لیے

ہنستے ہوئے دنیا میں نمودار ہوئے

جی بھر کے بھی دیکھا نہ تماشا ہم نے

سرمایہ لٹاتے ہوئے گلشن سے چلے

از آب و گلم سرشتہ من چہ کنم
وین پشم و قصب تو رشتہ من چہ کنم
ہر نیک و بدی کہ از من آید بوجود
تو بر سرِ من نوشتہ من چہ کنم

۱۷۵

تو نے ہمیں تخلیق کیا کِس کی خطا
جان و دل و احساس دیا کِس کی خطا
اعمال کہ ہیں جن کے لیے ہم معتوب
تو نے ہی مقدر میں لکھا کِس کی خطا

دوشش از سرِ لوح از صفای دلِ من

در میکده آن روح فزای دلِ من

جامی بمن آورد کہ لبستان و بنوش

گفتم نخورم گفت برای دلِ من

١٧٦

ساقی نے کہا مجھ سے بصد ناز و کرم

لے جامِ مئے ناب کہ ہے ساغرِ جم

میں نے جو کہا میں نہیں پیتا تو کہا

اِک گھونٹ بس ایک گھونٹ تجھے میری قسم

قومی متفکّرند در مذہب و دین
جمعی متحیّرند در شک و یقین
ناگاہ منادئی در آید ز کمین
کای بیخبران راہ نہ آنست و این

(۱۷۷)

کچھ لوگوں کو ہے تفکّرِ مذہب و دیں
کچھ لوگ ہیں حیرت زدۂ شک و یقیں
آئی یہ ندا جس کے طلبگار ہو تم
وہ جادۂ حق یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں

گر بر فلکم دست بُدی چون یزدان

بر داشتمی من این فلک را زمیان

وز نو فلکِ دگر چنان ساختمی

کازادہ بکامِ دل رسیدی آسان

(۱۷۸)

یزداں کی طرح گر مجھے قابو ہوتا

اس چرخِ ستم پیشہ کو میں ڈھا دیتا

پھر ایک فلک ایسا میں کرتا تعمیر

ہر دل کی تمنائیں جو پوری کرتا

اسرارِ ازل را نہ تو دانی و نہ من
وین حرفِ معمّا نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوی من و تو
چون پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

(۱۷۹)

دانائے بقا تو بھی نہیں میں بھی نہیں
آگاہِ فنا تو بھی نہیں میں بھی نہیں
ہے ذکرِ من و تو پسِ پردہ اے دوست
پردہ جو اُٹھا تو بھی نہیں میں بھی نہیں

روزی کہ ز تو گذشتہ شد یاد مکن
فردا کہ نیامدست فریاد مکن
بر نامدہ و گذشتہ بنیاد منہ
حالی خوش باش و عمر برباد مکن

۱۸۰

جو روز گزر چکا اسے یاد نہ کر
فردا کے لیے نالہ و فریاد نہ کر
فردا و گذشتہ کو نہ بنیاد بنا
خوش باش ابھی اور عمر برباد نہ کر

ننگ است بنامِ نیک مشہور شدن
عار است ز جورِ چرخ رنجور شدن
مخمور بہ بوی آب انگور شدن
بہ زانکہ بزہدِ خویش مغرور شدن

۱۸۱

ہے ننگ اگر نیک ہو مشہور کوئی
یا جورِ فلک سے ہو جو رنجور کوئی
اُس سے تو خرابات کا مے خوار اچھا
گر زہد و عبادت پہ ہو مغرور کوئی

بر خاطرِ غم پذیرِ من رحمت کن
یارب بدلِ اسیرِ من رحمت کن
بر پای خرابات روِ من بخشای
بر دستِ پیاله گیرِ من رحمت کن

۱۸۲

مجھ بندۂ دستگیر پر رحمت ہو
میرے دلِ غم پذیر پر رحمت ہو
ہاں بخش دے میخانہ نشیں قدموں کو
اور دستِ پیالہ گیر پر رحمت ہو

آن را کہ وقوف است بر احوالِ جہان
شادی و غم جہان برو شد یکسان
چو نیک و بدِ جہان بسر خواہد شد
خواہی ہمہ درد باش و خواہی درمان

(۱۸۳)

جو لوگ کہ ہیں محرمِ اسرارِ جہان
ہیں رنج و خوشی ان کی نظر میں یکساں
جب نیک و بدِ دہر نہیں پائندہ
اب خود کو ہمہ درد بنایا درماں

از گردشِ این دایرهٔ بی پایان
بر غور داری دو نوعِ مردم را دان
یا با خبری تمام از نیک و بدش
یا بیخبری از خود و از کارِ جہان

(۱۸۴)

آلام و مصائب کا جہنم ہے جہاں
ہر آن یہاں اٹھتے ہیں غم کے طوفاں
دو شخص ہی رہ سکتے ہیں آسودہ یہاں
یا مردِ خردمند یا مردِ ناداں

ای رفتہ بچوگانِ قضا ہمچو گو
چپ می خور و راست می رو و ہیچ مگو
کانکس کہ ترا فگندہ اندر تگ و پو
او داند و او داند و او داند و او

(۱۸۵)

چوگانِ قضا کی تو اگر گیند بنے
لازم ہے اشاروں پہ چلے کچھ نہ کہے
وہ جس نے تگ و دو میں تجھے ڈالا ہے
وہ جانے ہے وہ جانے ہے وہ جانے ہے

ناکردہ گناہ در جہان کیست بگو
وانکس کہ گناہ نکرد چون زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

(۱۸۶)

ناکردہ خطا کون ہے دنیا میں بتا
بے جرم و خطا کوئی یہاں کیسے جیا
گر میری خطا پر تو سزا دیتا ہے
پس بندہ و مولا میں کہاں فرق رہا

آن قصر که بر چرخ ہمی زد پہلو
بر درگہِ او شہان نہادندی رو
دیدیم که بر کنگرہ اش فاختۂ
بنشستہ ہمی گفت که کو کو کو کو

۱۸۷

وہ قصر کہ تھا چرخ پہ جس کا پہلو
جلتے تھے شب و روز جہاں جام و سبو
کل کنگرۂ قصر پہ کوئی کوئل
کہتی تھی یہی بیٹھ کے کو کو کو کو

بر دار پیالہ و سبو ای دلجو
بر گرد بگردِ سبزه زار و لبِ جو
کین چرخ بسی قدِ بتانِ مہرو
صد بار پیالہ کرد و صد بار سبو

(۱۸۸)

آ انجمنِ طرب سجائیں لبِ جو
لا ساغر و مینا اے نگارِ مہ رو
مت بھول مہ و مہر سے لاکھوں چہرے
سَو بار پیالہ بنے سَو بار سبو

ای پای شرف برسرِ آفاق زده
دی دم ہمہ از خلعتِ لولاک زدہ
وانگہ سرانگشتِ ارادت یک مشت
داغِ قصبِ ماہِ فلک چاک زدہ

۱۸۹

تو وہ ہے کہ جلوہ سرِ افلاک کیا
اور زیبِ بدن خلعتِ لولاک کیا
انگشتِ مبارک کے اشارے سے فقط
پیراہنِ سیمینِ قمر چاک کیا

این چرخ چون طاسیست نگون افتاده
در وی همه زیر کان زبون افتاده
در دوستیٔ شیشه و ساغر نگرید
لب بر لب و درمیانه خون افتاده

(۱۹۰)

یہ چرخِ فلک صورتِ گنبد ہے نگوں
اور اس میں ہیں سب اہلِ خرد زار و زبوں
دیکھے تو کوئی دوستیِ شیشہ و جام
پیوست ہیں لب اور ٹپکتا ہے خوں

آنہا کہ ز پیش رفتہ اند ای ساقی
در خاکِ غرور خفتہ اند ای ساقی
رَو بادہ خور و حقیقت از من بشنو
باد است ہر آنچہ گفتہ اند ای ساقی

۱۹۱

دے جام کہ جو گزر گئے ہیں ساقی
وہ خاکِ تکبّر میں پڑے ہیں ساقی
کچھ بھی نہ تھے دستارِ فضیلت کے سوا
گفتار کے بس غازی رہے ہیں ساقی

شخصی بزنِ فاحشہ گفتا مستی
ہر لحظہ بدام دیگری پابستی
گفتا شیخا ہر آنچہ گوئی ہستی
امّا تو چنانچہ می نمائی ہستی؟

۱۹۲

اِک شیخ نے اِک فاحشہ عورت سے کہا
ہرجائی ہے کس درجہ تو اے ننگِ وفا
عورت نے کہا ٹھیک ہے لیکن یہ بتا
باطن بھی ترا شیخ ہے ظاہر جیسا

چون ہست زمانہ در شتاب اے ساقی
بر نہ بہ کفم جامِ شراب اے ساقی
ہنگامِ صبوح قفل بر در زدہ ام
مَی دہ کہ آمد آفتاب اے ساقی

۱۹۳

جب تک ہو زمانہ یہ شتاب اے ساقی
گردش میں رہے جامِ شراب اے ساقی
لا جلد مے و جام کہ ہے وقتِ صبوح
اُبھرا وہ افق سے آفتاب اے ساقی

بر سنگ زدم دوش سبوی کاشی
سرمست بدم که کردم این اوباشی
با من بزبانِ حال می گفت سبو
من چون تو بدم تو نیز چون من باشی

(۱۹۴)

کل میں نے جو پتّھر یہ سبو دے مارا
آئی دلِ صد چاکِ سبو سے یہ صدا
بدمست جواں میں بھی کبھی تجھ سا تھا
مت بھول کہ تو بھی کبھی مجھ سا ہوگا

در سنگ اگر شوی چو نار ای ساقی
ہم آبِ اجل کند گذار ای ساقی
خاکی ست جہان غزل بخوان ای مطرب
باد است نفس بادہ بیار ای ساقی

(۱۹۵)

پتھر میں بھی گر کوئی چھپا اے ساقی
پیکانِ اجل سے نہ بچا اے ساقی
ہے خاک جہاں، چھیڑ غزل اے مطرب
ہے باد نفس، جام پلا اے ساقی

گہ گشتہ نہان وبکس نہ نمائی
گہ در صور کون و مکان پیدائی
این جلوہ گری بخویشتن بنمائی
خود عینِ عیانی و خودی بینائی

۱۹۶

آنکھوں سے نہاں ہے ترِی یکتائی بھی
اور دہر کے جلوؤں میں ہے پیدائی بھی
یہ ارض وسما آئینہ خانہ ہے ترا
تو خود ہی تماشا ہے تماشائی بھی

ہنگامِ صبوح ای صنمِ فرّخ پی
برساز ترانہ وبپیش آور می
کافگند بخاک صد ہزاران جم وکی
این آمدنِ تیر مہ ورفتنِ دی

(۱۹۷)

ہے موسمِ گل اے صنمِ فرّخ پے
ہاں تیز رہے ساز کی لے گردشِ مے
مت بھول کہ ان پھولوں کے مرجھانے تک
مل جائیں گے مٹّی میں ہزاروں جم وکے

تا درتنِ تُست استخوان ورگ وپَی

از خانۂ تقدیر منہ بیرون پَی

گردن منہ از خصم بود رستمِ زال

منت مگیر از دوست بود حاتمِ طیَ

۱۹۸

جب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا

تقدیر کی حد سے قدم آگے نہ بڑھا

رستم بھی مقابل ہو تو گردن نہ جُھکا

حاتم بھی ہو گر دوست تو احساں نہ اُٹھا

تنگی میِ لعل خواہم و دیوانی
سدّ رمقی باشد و نصفِ نانی
وانگہ من و تو نشستہ در ویرانی
خوشتر بود از مملکتِ سلطانی

۱۹۹

گر جام بکف تجھ سا حسیں ہے ساقی
دیوانِ غزل نانِ جویں ہے ساقی
پھر دشت ہو گلشن ہو کہ ویرانہ ہو
میرے لیے فردوسِ بریں ہے ساقی

ای کاش کہ جای آرمیدن بودی
یا این رہِ دور را رسیدن بودی
کاش از پیِ صد ہزار سال از دلِ خاک
چون سبزہ امید بر دمیدن بودی

۲۰۰

آرام کہیں بیٹھ کے دو پل کرتے
صدیاں ہوئیں اس راہ پہ چلتے چلتے
منزل تھی اگر دور تو دم بھر کے لیے
اے کاش کہیں خاک پہ سبزہ بنتے

ای دل زغبارِ جسم اگر پاک شوی
تو روحِ مجرّدی برافلاک شوی
عرش است نشیمنِ تو شرمت بادا
کائی و مقیمِ خطۂ خاک شوی

۲۰۱

اے دل جو غبارِ تن سے تو پاک بنے
تو روح تری طائرِ افلاک بنے
اے عرش نشیمن ہے بڑے شرم کی بات
تو فرش پہ آکے ساکنِ خاک بنے

ای دل ز شرابِ جہل مستی تا کَے
وی نیست شونده لافِ ہستی تا کَے
ای غرقہ ز بحرِ غفلت ار ابر نہٗ
تر دامنی و ہوا پرستی تا کَے

۲۰۲

صہبائے جہالت کی یہ مستی کب تک
اے صیدِ اجل غرورِ ہستی کب تک
تو ابر نہیں ہے اے غریقِ غفلت
تر دامنی و ہوا پرستی کب تک

بر رہگذرم ہزار جا دام نہی
گوئی کہ بگیرمت اگر گام نہی
یک ذرّہ ز حکمِ تو جہاں خالی نیست
حکم تو کنی و عاصیم نام نہی

۲۰۳

تو راہگذر میں مرے سو دام بچھائے
پھر راہ پہ چلنے کی بھی ترغیب دلائے
اے قادرِ مطلق یہ تماشا کیا ہے
خود قید کرے اور مجھے عاصی ٹھہرائے

اے مفتیِ شہر از تو پرکار تریم
با این ہمہ مستی ز تو ہشیار تریم
تو خونِ کسان خوری و ما خونِ رزان
انصاف بدہ کدام خونخوار تریم

(۲۰۴)

ہم تجھ سے بھی پرکار ہیں اے مفتیِ شہر
مستی میں بھی ہشیار ہیں اے مفتیِ شہر
ہم مے پیئں اور تو پیے خونِ انساں
ہاں، ہم ہی گنہگار ہیں اے مفتیِ شہر

از تن چو برفت جانِ پاکِ من و تو

خشتی دو نهند بر مغاکِ من و تو

وانگاه برای خشتِ گورِ دگران

در کالبدی کشند خاکِ من و تو

۲۰۵

جب تن سے ترے جان نکل جائے گی

بے جان بدن قبر نگل جائے گی

اِک روز کسی تربتِ پختہ کے لیے

پھر خاک تری اینٹوں میں ڈھل جائے گی

ای ذاتِ تو بر جملہ ممالک مالک

دی راہ روانِ کوی عشقت سالک

من بدعِ تو از کلامِ حق می گویم

اَنْتَ الْبَاقِی وَکُلِّ شَیْءٍ ہالِک

۲۰۶

اے خالق و اے دونوں جہاں کے مالک

طالب ہیں ترے جادۂ حق کے سالک

قرآں تری عظمت میں ہے یوں نغمہ سرا

اَنْتَ الْبَاقِیْ وَکُلِّ شَیْءٍ ھَالِکٌ